

پہلی بات

میرا پہلا مشورہ تو یہ ہے کہ آپ یہ کتاب نہ پڑھیں۔ بر باد ہو جائیں گے، خوار ہو جائیں گے۔ آپ سوچیں گے کہ یہ بات تو بالکل ایسے ہے جیسے سگریٹ کا خوبصورت اشتہار دکھا کر کھا جاتا ہے۔ ”خبردار تمبکتو نوشی صحت کے لئے مضر ہے“، مگر لوگ اس وارنگ کے باوجود سگریٹ نوشی سے بازنہیں آتے۔ بالکل اسی طرح لوگ ”علی پور کا ایلی“ پڑھنے سے بھی بازنہیں آتے۔

حال ہی میں مجھے ایک نوجوان کا خط ملا۔ لکھا تھا ”سر میں علی پور کا ایلی پڑھ کر خراب ہو گیا۔“

ایک دن دونوں جوان لڑکیاں ہمیں سے پاس آئیں کہنے لگیں۔ ”ہم نے ممتاز مفتی کو پڑھا ہے۔ علی پور کا ایلی پڑھ کر زندگی کے متعلق ہماری سوچ تبدیل ہو گئی ہے، سر ہم سچ بولنا چاہتے ہیں۔ ہم نے فیصلہ کیا ہے آئندہ سچ بولیں گے۔“ میں نے کہا بی بی ابھی آپ کی عمر ان گورکھ دھنڈوں میں پڑنے کی نہیں۔ اپنی تعلیم پر توجہ دو اور زندگی گزارنے کے لیے کسی بہتر را کا انتخاب کرو بولیں۔ ”میں سر اب ہم نے سچ بولنا ہے۔“

عجیب بات ہے ممتاز مفتی کو ”علی پور کا ایلی“ لکھے ہوئے کم و پیش چالیس سال گزر چکے ہیں، ان کے انتقال کو بھی پانچ سال ہو گئے ہیں مگر مجھے اب تک ان کی ذات کے بارے میں ان کی کتابوں کے بارے میں ایسے عجیب و غریب خطوط موصول ہوتے ہیں کہ میں حیران رہ جاتا ہوں کہ ممتاز مفتی کی شخصیت کے اس پہلو کو تو مجھے علم ہی نہیں۔ یہ لوگ کیوں ایک ایسے شخص کے لیے جذباتی ہو رہے ہیں جواب اس دنیا میں نہیں۔ یہ عقیدہ تو اب رفتہ رفتہ کھل رہا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔

بانو قدسیہ نے ممتاز مفتی کے بارے میں لکھا تھا ”جب کوئی بزدل بھا در میدان جنگ پار کر شام کے اندر ہیرے میں معدوم ہوتا چلا جاتا ہے تو فنا اس کی ناطقی کا

فائدہ اٹھا کر ایسا بھالا مار کر گرتی ہے کہ دیر تک فضا میں اس کے گرنے کی صدائی بھی آہستہ کبھی Echo بن کر آتی رہتی ہے۔ اسے زمانہ دیر تک بھول نہیں پاتا۔ بہادر انسان جو خوفزدہ بھی ہواں کے پار جانے کا منظر بھی عجیب ہے۔ شکنہ رو سپاہی کا رزار سے چلا تو جاتا ہے لیکن یہ منظر اس کے چاہئے والوں کو کبھی بھولتا نہیں۔ جانے والے نے اتنی جگہ آپ کے دل میں گھیری ہوتی ہے کہ مدتیں یہ خلائق میں بھرتا۔ دیر تک اس کے گرنے کی آواز آتی رہتی ہے۔ کبھی سماں میں سائیں بن کر، کبھی Echo کی طرح پھیلی ہوئی اس کے ذکر سے لوگ خالی نہیں ہوتے۔“

بہر حال ”علی پور کا ایلی“، ایک باغی شخص کی ایسی داستان حیات ہے جو اپنی شخامت کے باوجود ختم کیے بغیر چھوڑی نہیں جاتی اور اس کا شمار اراد و ادب کی سب سے ضخیم اور زیادہ پڑھی جانے والی کتابوں میں ہوتا ہے۔

عکسی مفتی

۲۶ جنوری ۲۰۰۱ء

دیباچہ برائے بارچخم

۱۹۹۵ء

میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ اس کتاب کی اتنی ایڈیشن شائع ہوں گی اور اس کی مانگ اس قدر بڑھ جائے گی۔ میرے وہم و مگان میں بھی نہ تھا کہ مشاہیر اردو ادب اس کتاب کو تسلیم کر لیں گے اور اردو ادب میں اسے ایک مقام بخش دیں گے۔ میں اردو ادب کے وسعتِ تلب کا مر ہون منت ہوں چونکہ یہ میرنی کوششوں یا جدوجہد کی وجہ سے نہیں ہوا۔ مجھ میں کبھی خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ادیب بنوں۔ کس پر تے پر ہوتی نتوں میں اردو زبان سے واقف تھا نہیں میں نے کبھی اردو ادب کا مطالعہ کیا تھا۔

میں اس زمانے کی پیداوار ہوں جب اردو زبان پنجاب میں درنیں آئی تھی۔ ہم لوگ گھروں میں محلوں مدرسوں میں کالجوں میں فنزوں میں ہر جگہ بے تکلف پنجابی بولتے تھے۔ مدرسوں میں صرف آٹھویں جماعت تک اردو پڑھائی جاتی تھی۔ کالجوں میں اردو کا وجود نہ تھا۔ اور نیشنل لینگو انسٹی گیڈ کے لئے الگ کالج بنائے گئے تھے۔ ان کی حیثیت ایسی تھی جیسے برلنیوں کے آشرم کے قریب ہر یونیورسٹی کتابی بیوی۔ اور نیشنل کالج کے طلباء کو اجازت تھی کہ تحصیل علم کے بعد صرف انگریزی کا پر چوہ کروہ گریجویٹ ڈگری کے حقدار ہو سکتے تھے۔ ایسے گریجویٹ کو عرف عام میں تحقیر سے واپس بخندنا کہا جاتا تھا۔

ان دنوں میں یکسر مغرب زدہ نوجوان تھا ان حالات میں میں اردو ادیب بننے کی خواہش کیسے کر سکتا تھا۔

اس زمانے میں میں کیوں اردو میں لکھتا رہا بظاہر اس کی صرف ایک وجہ تھی ؎ صد۔ میر اموقف یہ تھا کہ صرف ادیب ہی کو لکھنے کا حق نہیں ہے غیر ادیب بھی لکھ سکتا ہے۔ آپ اسے ادیب نہ مانے گا لیکن لکھنے کا حق تو دیجئے ہا۔

در اصل یہ سارا گور کو دھنڈ تقدیر کا چلا یا ہوا تھا۔ اپنا راستہ ہموار کرنے کے لئے تقدیر کو کیا کیا گھسن گھیریاں چلانی پڑتی ہیں۔

علی پور کا ایلی میں نے اردو ادب کے خلاف احتجاج کے طور پر لکھی تھی۔ اردو ادب کئی ایک پہلوؤں میں بڑا جلا تھا بڑا مہندب تھا بڑا اخلاق زدہ تھا، اس حد تک کہ حقیقت پسندی سے بے گانہ ہو جاتا تھا۔ اردو ادب کی خود نوشتیں بڑی دھلی و حلالی، کلف زدہ اور استری کی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا ایک سچی خود نوشت پیش کروں۔ اخلاق اور تہذیب سے بے نیاز۔

در اصل یہ کتاب میں نے اردو ادب پر پڑھنی کی بیانیت سے لکھی تھی اور میرا خیال تھا کہ یہ کتاب چھینٹے اڑائے گی شورا شوری پیغمبر کا لائے گی اور پھرنا میں نا میں فرش ہو کر رہ جائے گی۔

لیکن یہ کتاب تو چل نکلی۔ اپنی سچائی اور اردو ادب کی وسعت تلب کی وجہ سے۔ تقدیر کے بھید کس نے پائے ہیں۔

متاز مفتی

جولن ۱۹۹۵ء

پیش لفظ

(تیرا ایڈیشن)

یہ کتاب میری آپ بنتی کا پہلا حصہ ہے۔
 پہلے مجھ میں اتنی جرأت نہ تھی کہ اپنی خامیوں، جیلوں اور بے راہ رویوں کو اپناتا۔
 اس لئے میں نے اپنے روئیداد کا نام دے دیا۔
 یہ آپ بنتی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۲۷ء تک مشتمل ہے۔ اس آپ بنتی میں واقعہ ہر کردار
 حقیقت پر تینی ہے افسانہ زگاری اسلوب میں ہوتا ہو واقعات میں حقیقت گولی سے
 کام لیا گیا ہے۔ یہی اس کتاب کی انتیار خصوصیت ہے۔
 ارادہ تھا کہ سوانح کا دوسرا حصہ ”ایلی اور الکھنگری“ کے عنوان سے پیش کروں
 گا، لیکن الکھنگری والوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو
 پر وہ دری پسند نہیں۔ الہذا معدود ہوں۔

مورخہ ۲۶ نومبر ۱۹۸۲ء

متاز مفتقی

(دوسرا ایڈیشن)

اس کتاب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۱ء میں چھپا تھا جو دو سو پچاس جلدیوں پر مشتمل تھا۔ یہ
 ایڈیشن افراتفری میں چھپا۔ یہ افراتفری آدم جی انعام سے متعلق تھی۔ ”اب یہ
 کتاب اس لئے مشہور ہے کہ اس پر آدمی جی انعام نہ ملا۔“ (ابن انشا)
 صرف دو سو پچاس جلدیں چھپنے کے باوجود اس کتاب کو اتنے افراد نے پڑھا ہے
 کہ جان کر حیرت ہوتی ہے۔ اب سعادت افرزادہ اور چودھری بشیر احمد کی تحریک پر
 اس کا دوسرا ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے۔

بیشتر لوگ جنہوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اس بات پر مصر ہیں کہ یہ ناول

ہے۔ محمود ایاز کہتے ہیں کہ ”یہ تلاش ذات کا ناول ہے۔“ ابن انشا کا کہنا ہے کہ ”یہ ناولوں کا گرنچھے صاحب ہے۔“ سعادت اور فرزانہ کا خیال ہے کہ ”اس ناول میں ایسے کلڑے بھی ہیں جنہیں پڑھ کر پھر سے جینے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔“ ایسے قاری بھی ہیں جو کہتے ہیں کاش یہ ناول ہوتا اور رومان کے نقطہ عروج کے بعد ختم ہو جاتا۔ ایسے قاری بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ اسے ایسا ہی ہونا چاہئے تھا جیسے کہ ہے۔

خوشی اور تعجب کی بات ہے کہ اس طویل کتاب کوئی ایک اعلیٰ افسروں نے بھی پڑھا ہے جن کی عدم الفرقتنی کا یہ عالم ہے کہ نیگم کے پاس بیٹھ کر پروپریویٹ کی بد خوبیاں کرنے کی عشرت سے بھی محروم ہیں اور ان کی لامائے اس کتاب کے متعلق خاصی شفاقت ہے۔

اپنی دانست میں میں نے ناول نہیں بلکہ ایلی کی سرگزشت لکھی تھی۔ مقصد تھا کہ ایلی کی شخصیت کا ارتقاء پیش کروں۔ اسی لئے چند ایک بظاہر غلط تفصیلات پیش کرنے سے گرینہیں کیا یہ اور بات ہے کہ ایلی ایسا کردار ہے جو مشاہدات کے سمندر میں ڈکیاں کھاتا ہے۔ لیکن جب کنارے لگتا ہے تو پنچھی کی طرح پر جھاؤ کر پھر سے جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے ۔۔۔ شاید ہم سب پنچھی ہوں اور کنارے لگنے کے بعد پر جھاؤ کر جوں کے توں خشک ہو جاتے ہوں۔

بہر حال اردو ادب میں کوئی کہانی ایسی نہ ملے گی؛ جس کی تفصیلات برآہ راست زندگی سے اخذ کی گئی ہوں اور چنان کئے بغیر ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہوں ۔۔۔ اس لحاظ سے یہ کتاب آپ مبتدا ہے۔

ایلی کا کہنا ہے کہ یہ کتاب ہی نہیں بلکہ ایک خط ہے جو اس نے سادی اور عالیٰ کے نام لکھا ہے۔ بری الذمہ ہونے کے لئے نہیں بلکہ ایک اعتراف جرم کے لئے۔

مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے دوسرے حصے ”ایلی اور الکھنگری“ کی تجھیل کے بعد یہ کتاب ارتقا کی ایک اہم کڑی کی حیثیت اختیار کر لے گی اور اس کے دھواں دار

اندھیرے، آنے والی کرن کو مزید چمک بخشنیں گے۔ اور دونوں حصے مل کر تلاش ذات کا ناول بن جائے گا۔ لیکن بارہ سال الکھنگری کی دلیزیر پر بیٹھنے کے بعد مجھے شک پڑنے لگا ہے کہ شاید الکھنگری ایک دلیزیر کے سوا کچھ بھی نہ ہو جسے پار کر کے آپ مرکرا پنے ہی دل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جہاں ایک عظیم تر کائنات سر وجود ہے۔

راولپنڈی - جنوری ۱۹۶۹ء

متاز مفتی

All rights reserved.

(پہلا ایڈیشن)

۱۹۳۶ء میں میں نے اپنا پہلا افسانہ "جھلک جھلک آنکھیں، پیش کیا تھا، آج میں اپنی پہلی مسلسل کتاب "علی پور کا ایلی، پیش کر رہا ہوں" یہ روئیدا دے ہے۔ ایک ایسے شخص کی جس کا تعلیم کچھ نہ بگاڑ سکی۔

جس نے تجربے سے کچھ نہ سیکھا۔

جس کا ذہن اور دل ایک دوسرا سے اجنبی رہے۔

جو پروان چڑھا اور بآپ بختی کے باوجود و پچھا ہی رہا۔

جس نے کئی ایک محبتیں کیں، لیکن محبت نہ کر سکا، جس نے محبت کی پھل بھریاں اپنی اٹا کی تیکین کے لئے چلا کیں، لیکن پر دگی کے عظیم جذبے سے بیگانہ رہا اور شعلہ جوالہ پیدا نہ کر سکا۔

جوز ندگی بھرا پنی انا کی وحدتی بھول بھلیوں میں کھویا رہا، حتیٰ کے بالآخر نہ جانے کہاں سے ایک کرن چمکی اور اسے نہ جانے کدھر کو لے جانے والا ایک راستہ مل گیا۔

اس داستان کے بیشتر واقعات اور مرکزی کردار حقیقت پر مبنی ہیں۔ باقی کردار حقیقت اور افسانہ کی آمیزش ہیں۔ حقیقت سے گرینز کی وجہ میرا عجز ہے۔ ان

کرداروں کی عظمت کو اجاگر کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ لہذا افسانوی رنگ شامل کر کے میں نے اپنے عجز کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کا مقصد صرف ایلی کی داستان حیات پیش کرنا ہے۔ کسی متعلقہ یا ضمنی کردار کی ول آزاری، تفحیک یا تذلیل نہیں۔ اگر اس کتاب کے کسی حصے سے ایسا پہلو نکلتا ہے تو وہ میری تحریر کے خام ہونے اور وہ معنٰت نگاہ کی کمی کی وجہ سے ہے۔

شاید آپ علی پور سے ایلی کی رو سید او پسند کریں تو شاید میں بھی کبھی دوسری کتاب میں اس ”نہ جانے کہاں سے چمکنے والی کرن“ اور ”نہ جانے کہ ہر کو لے جانے والے رات“ کا تذکرہ کروں، جس کے اشارے پر اس کتاب کا اختتام ہوتا ہے اور جس پر گامزن ہونے کے لئے ایلی پر قول رہا ہے۔

متاز مفتی

راولپنڈی ۲۵ جون ۱۹۶۱ء

بانوقد سیہ

اگر آپ کو غزل الغزالت پڑھنے کا شوق ہے اور آپ عورتوں سے باقیں کر کے مسرت حاصل کرتے ہیں تو ”علی پور کا ایلی“ ضرور پڑھئے۔

اگر آپ جانتے ہیں کہ مرد بُخ کی مانند ہے ہمیشہ اوپر سے پانیوں میں تیرتا ہے اور مجھلی کی طرح تحلے پانیوں میں نہیں جا سکتا تو بھی ”علی پور ایلی“ آپ کے لئے مسرت کا بابا عث ہوگی۔

اگر آپ میں تجسس کا مادہ ہے اور آپ بچپن میں بھول بھلیاں اور پھیلیاں لو جھتے رہے ہیں تو آپ کے لئے ”علی پور کا ایلی“ وہ شہری پوشتیں ہے جو ہزار منزلوں کے بعد شہزادے کو ملی تھیں۔

اگر آپ لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں اور مکمل طور پر مردم بیزار نہیں ہوئے تو ”علی پور“

کا ایلی، ضرور پڑھئے اس میں اک جہان آباد ہے۔ لیکن اگر آپ بچپن میں پوری کہانی کو چار سطروں میں بیان کرنے کا فن سیکھے چکے ہیں، جوانی میں آپ نے صرف وہ کتابیں پڑھی ہیں جن کے آخر میں سری درج ہوتی ہے اور اگر طبعاً آپ کم گودست بات کرنے والے اور انکلیوں پر گن گن کر گفتگو کرنے کے قادر ہے ہیں تو یہ کتاب آپ کے لئے بے کار ہے۔ اس سے بہتر ہو گا کہ آپ اس کی سری کسی ایسے دوست سے سن لیں جس نے اسے غور سے پڑھا ہوا اس سے لطف اندوز نہ ہو سکا ہو۔

اشفاقِ احمد

جب ”علی پور کا ایلی“ شائع ہوا تو میں اسے اردو زبان کا ایک عظیم ناول تصور کیا کرتا تھا، انہی دنوں ناشر نے اسے آدم جی پر انز کے لئے گلڈ کے فتر میں گزارا۔ ججوں نے اسے ”پڑھا“ اور اس پر ”غور“ کیا۔ پھر فیصلہ دیا کہ ”علی پور کا ایلی“، اس قابل نہیں کہ اسے آدم جی انعام سے نواز جائے۔ چونکہ یہ ملک کے پانچ بڑوں کا فیصلہ تھا اس لئے مجھے بھی اپنی رائے میں تبدیل کرنا پڑی۔ اس وقت سے لے کر اب تک میری رائے ویسی ہی چلی آرہی ہے کہ پچھلے دنوں اس ناول کو پھر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چونکہ بزرگوں کی عزت کرنے کا حکم مجھے بچپن سے ملا ہے، اس لئے میں ان کے فیصلے پر قائم رہنے پر مجبور ہوں۔

ویسے میرا دل پکار کر کہتا ہے کہ ”فسانہ آزاد“ اور ”علی پور کا ایلی“، اردو کے دو عظیم ناول ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے دل کی آواز مجھے ہی تک محدود ہے۔ ورنہ بڑا اہنگا مہ کھڑا ہو جاتا۔

آپ اس ناول کو پڑھئے لیکن اپنی رائے قائم کرنے کے بجائے فاضل ججوں کے فیصلے کے پاہندر ہیئے کیونکہ یہ اردو ادب کی تاریخ کا اہم فیصلہ ہے اور اس کو بنیاد بنا کر مستقبل کے ادب کے بارے میں اقوال فیصل دیئے جانے چاہئیں۔

ضمیر جعفری

متاز مفتی اردو ادب میں اسلوب دیگر کے الگ دبتان کے خالق ہیں۔ ان کے فن اور فکر کو میں ایک ایسے جوان رعناء سے تشبیہ دوں گا جو دیکھنے میں بہت الہڑ مگر سوچنے میں نہایت بالغ ہے۔ اپنے اس سے پیار بھی کر سکتے ہیں اور بصیرت بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ مفتی کا ادب زندہ ہی نہیں ہمیشہ جوان بھی رہے گا۔ سوچتا ہوں اگر متاز مفتی پیدا نہ ہوتا تو زندگی کئی رعنائیوں اور لچکپیوں سے محروم رہ جاتی۔

”علیٰ پور کے ایلی“، کوئیں اسی دور کا ایک اہم ادبی کارنامہ سمجھتا ہوں اور زندگی کے اس قدرہ سبق مخالف پر یہ کارنامہ شاید متاز مفتی ہی سرانجام دے سکتا تھا کتاب کی ”فرہی اہر اہر کی“ ”چربی“ سے جمع نہیں کی گئی خود مصنف کے خون جگر سے صورت پذیر ہوئی ہے۔

کرتل محمد خان

جب متاز مفتی کی کتاب ”علیٰ پور کا ایلی“ کو آدم جی انعام نہ مل سکا تو معاہمیں احساس ہوا کہ یہ ضرور کام کی کتاب ہو گی، اسے پڑھنا چاہئے اور پڑھی تو ہمارا ہی حال ہوا جو ”ان“ کی تقریب سن کر غالب کا ہوا تھا، یعنی:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے
کسی ادب پارے کی عظمت پر کھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی کسوٹی نہیں
ظاہر ہے کہ متاز مفتی کے منکروں کے بھی دل تو مومن ہوں گے اُصرف
دماغ کافر ہیں۔

قدرت اللہ شہاب

مفتی اگر ادیب نہ ہوتا تو جرام پیشہ ہوتا۔ چونکہ لاشور اس کی تحریروں کا موضوع ہے اور انسانی لاشور میں نہ جانے کتنے محمد خان اور پھوپٹ ڈاکو چھپے بیٹھے ہیں۔

مفتی عقیدے کا روگ نہیں پالتا، ہاں عقیدت کا شکار ضرور ہوتا ہے جب وہ

عقیدت طاری کرے تو اس شخص کی زندگی حرام ہو جاتی ہے جس سے مفتی کو عقیدت ہو۔ اس وجہ سے مفتی کی دوستی ایک ایسے پھوٹے کی طرح ہے جس کی ٹیکسوس میں لذت ہے۔ ”علی پور کا ایلی“، میں مفتی بتدربن محبت سے عقیدت کی جانب بڑھ رہا ہے۔ شہزادہ مفتی کی محبت کے پھوٹے کی ٹیکسوس اور لذت کی دو دھاری چھری تلے ترپ پر رہی ہے۔

مفتی کی زندگی پر صوفی کی گہری چھاپ ہے۔ اس کی تحریریں شعور اور لاشعور کے تصادم کو سمجھاتے ہوئے تصوف اور سلوک پر ختم ہوتی ہیں۔ ”علی پور کے ایلی“، میں مفتی نے انسانوں میں لاشعور کے تجزیاتی نظام کو تصوف کی ابتداء کے پہلے موڑ پر پہنچا دیا ہے۔

اگر مفتی ”علی پور کا ایلی“ کا دوسرا حصہ لکھنے میں کامیاب ہو گیا تو اندازہ ہے کہ محبت اور عقیدت کا دو آتش روکریہ کتاب ایک خصوصی اہمیت حاصل کر لے گی۔

جمیل الدین عالی

آدم جی ادبی انعام کی ایک مجلس متصفین ہوتی ہے۔ میں پہلے سال سے اس کا معتمد اعزازی ہوئا کام انتظامی ہے اور ضابطے کی رو سے میں کتابوں کے بارے میں حق رائے وہی نہیں رکھتا۔

جب اس کتاب (علی پور کا ایلی) پر غور ہوا، اس مجلس کے صدر تھے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور اراکین تھے پروفیسر ممتاز حسن، پروفیسر وقار عظیم اور دیگر مشاہیر جن کے نام شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب علی پور کا ایلی کو بہترین نہ سمجھا، بلکہ جمیلہ ہاشمی کی ”تلائش بھاراں“ کو انعام کا مستحق قرار دیا۔ متصفین نے اپنی رائے دے دی جس کا احترام کیا گیا اور انتظامی پابندی بھی کی گئی۔ مجلس متصفین کی کارروائی خفیہ رکھی جاتی ہے صرف متفقہ یا اکثریتی رائے کی تشویح کی جاتی ہے۔ اس لئے میں اس کارروائی کا حال نہیں بتا۔

لیکن ایک قاری کی حیثیت سے مجھے ہمیشہ یہ کہنے کا حق ہے کہ یہ فیصلہ اردو ادب کے ساتھ کم از کم ایک نا انصافی کے مترادف تھا۔

ابن انشا

”علی پور کا ایلی“، ممتاز مدحتی کا بڑا بھاری کارنامہ ہے۔ جنم اور وزن کے اعتبار سے ہی نہیں، مضمون، پلاٹ اور اسلوب کے لحاظ سے بھی، پچھلے لوگ اسے اردو ناولوں کا گرو گرنٹھ صاحب بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ ہاتھ میں اٹھا کر مطالعہ کرنے کی چیز نہیں بلکہ اسے چوکی پر رکھ کر مورچھل ہلکاتے ہوئے پڑھنا پڑتا ہے۔ اسے نئے ادب کی طسم ہوش ربا بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ قدم قدم پر ہفتھواں آتے ہیں جن سے گزرتے ہوئے ہیر و کہ اور قاری کے ہوشی کم ہوتے ہیں۔ کردار پر کردار چڑھا ہوا ہے، طسم میں طسم گرفتار ہے اور افسانہ افسانہ می خیزو۔ اس کا شائل بھی افسانے سے زیادہ داستان کا ہے۔ کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے۔ زمان و مکان کی زندگی نہیں ہیں، جن سے پائے نگاہ میں موج آنے کا اندر یہ ہوئی ناول قلم سے کم کمرے سے زیادہ لکھا گیا ہے اور اس کا فوسکس ایلی پر رہتا ہے۔ اس ناول کے دونوں ایاں پہلو ہیں، راست بازی اور کردار تراشی۔ راست بازی روسو کی ہی نہیں کہ غلوکی وجہ سے ریا بن جائے بلکہ سادہ غیر جذباتی اور سادہ بارن قسم کی۔ کردار بنانے میں مفتی جلدی نہیں کرتے، کچھ پکے سو یعنی ہا ہو۔ ایک کردار کی تشكیل میں پچاسوں صفحے اور دسیوں رس صرف ہو جاتے ہیں لیکن پھر وہ ایسا ہوتا ہے کہ شن شن بجتا ہے۔ پھر پر نقش ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ ناول پڑھے بہت دن ہوئے، لیکن آج بھی علی احمد ہو یا شہزاد سادی ہو یا انصار منصر، تسلیم ہو کہ ارجمند ذہن میں اپنی اپنی جگہ قطب نما بنے کھڑے ہیں۔ ہر ایک کی سچ و نصیح الگ، خمیر جدا، دو لہا اس بارات کا ایلی سہی، لیکن آگے چل کر شہزاد سے پچھاڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ پاپن جو یوں جلی نہ کوئلہ نبی نہ را کھا کر اردو ادب کے لازوال کردار کے طور پر زندہ رہے گی۔ پھر سادی ہے جس نے اس قصے میں شوختی

اور رومان کارنگ بھرا ہے ایک قتلی جو ہاتھ نہیں آتی، ایک غزال جو وحشت کرتا ہے۔ ایسی پر تو اس ناول میں حق کو خود مختاری کی تھمت ہے وہ تو ان تین جیشیوں علیٰ احمد (باپ) شہزاد اور ساوی کے درمیان کوڑے کھاتا پا بخواں چلا جا رہا ہے، چلا جا رہا ہے babarLah بارہ صفحے کے اس ناول کو شروع کر کے ختم کئے بغیر رکھنا مشکل ہے، جس نے پڑھا ایسے پڑھا کہ کام سے یاد فتر سے چار دن کی چھٹی لی اتنے دن کی رسدا اور پانی کی ایک ملکی پاس رکھ لی۔ یوں اور تاجروں اور ان لوگوں کے پڑھنے کی یہ چیز نہیں جن کا الحدیث اپنی قسمی ہوتا ہے اور جو صرف منڈیوں کے بھاؤ اور دینہما کے استھان پڑھنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں غالباً انہیں طبقوں کا مقابلہ نظر تھا کہ قوم جی انعام کے فاضل بجوں نے انعام نہ دے کر قوم کو اس ناول سے بچانے کی کوشش کی لیکن تقدیر پر کس کا بس چلتا ہے۔

سنا ہے اب یہ دوبارہ شائع ہو رہا ہے۔

علی پور کا ایلی

ایلی

اس کا نام الیاس تھا۔ لیکن گھر میں بھی اسے ایلی کہا کرتے تھے۔
 ”ایلی____“ اس کے ابا آواز دیتے۔ ابا کی آواز سن کر اس کا دل دھک سے
 رہ جاتا۔ ”ایلی۔ حقہ بھر دو۔“ وہ چپ چاپ اٹھ بیٹھتا۔ ابا کے کمرے کا دروازہ بند
 دیکھ کر ایک ساعت کے لئے چکچاتا، محسوس کرتا کہ اس بند کمرے میں داخل ہونا
 ٹھیک نہیں۔ دبی آواز میں کھانے کی کوشش کرتا تاکہ کمرے کے لوگ اس کی آمد
 سے مطلع ہو جائیں۔ لیکن اس کی آواز حلق میں سوکھ جاتی۔ پھر وہ بڑی کوشش سے
 چلاتا۔ ”آیا جی،“ اور جرات گرفتے دروازہ کھولتا لیکن دروازہ کھولنے سے پہلے اپنی
 نگاہیں جھکالیتا اور ایسا انداز اختیار کر لیتا۔ جس سے ظاہر ہو کہ حقہ کے علاوہ اسے
 کمرے کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ کمرے میں ابا کو اکیلے دیکھ کر اس کے دل سے
 بو جھواتر جاتا پھر وہ بے فکری سے حقہ کی طرف بڑھتا۔

اس کے ابا عام طور پر چٹائی پر بیٹھے ڈیک پر رکھے ہوئے رجھڑ میں لکھنے میں
 مصروف رہتے تھے۔ وہ تمیض اتار کر بیٹھا کرتے تھے۔ ان کی دھوتی میلی ہونے کے
 علاوہ پھٹی ہوئی تھی اور اس کے پلوؤں کو ادھراً دھر سر کے رہنے کی بری عادت تھی جو
 ایلی پر بے حد گراں گزرتی۔ ”ہوں____ کیا ہے۔“ ابا گھور کر اس کی طرف یوں
 دیکھتے جیسے وہ خواہ خواہ کمرے میں آگھسا ہو۔ ”جی۔ جی۔ چلم“ ایلی ان کی دھوتی کی
 طرف نہ دیکھنے کی شدید کوشش کرتے ہوئے جواب دیتا اور پھر چلم اٹھا کر دروازے
 کی طرف بھاگتا۔

”ایلی____“ اس کی سوتیلی ماں صفیہ اسے آواز دیتی۔ ”بازار سے سو والوں
 ایلی۔“

صفیہ کی آواز سن کر اس کے دل میں غصے کی ایک لہر اٹھتی لیکن اس کے باوجود دوہو

چلاتا۔ ”آیا جی۔“ ابا کا ڈیکھ خالی دیکھ کر اس کا انداز دفتار بدل جاتا۔ ”جی،“ اس کی آواز میں لجاجت نہ رہتی لیکن اس کے باوجود اس کی نگاہ جھکی جھکی رہتی۔ ”یہ لوپیے،“ صفیہ کے دوختنا مالیدہ ہاتھ اس کی طرف بڑھتے جن میں زرد میلی انگوٹھیاں اس کا منہ چڑھاتیں اور پھر انگلیوں سے نکل کر وہ گھومتے ہوئے میلے چکر ایلی کی طرف یورش کرتے وہ ڈر کر گھبرا کر پیچھے ہٹ جاتا۔ اس کی طبیعت باش کرنے لگتی۔ نہ جانے کیوں اسے مہندی لگے ہاتھوں اور انگوٹھی سے سخت نفرت تھی۔ حکومتی ہولی نفرت وہ اپنی نگاہیں ان ہاتھوں سے بہلانے کی کوشش کرتا۔ لیکن بہار کمرہ مہندی والے ہاتھوں سے بھر جاتا اور انگوٹھیاں تمام جگہ پر پھچا جاتیں۔ مہندی کی بوچاروں طرف سے اسے گھیر لئی چاروں طرف غلاظت کے ذمہ پر نگلے پندے کے انبار اور ان کے درمیان صفیہ کا سرخ و سپید باوقار چہرا!

ایلی کو اس منظر سے بے حد نفرت تھی نہ جانے اس کے دل کی گہرائیوں میں طوفان سا کیوں آ جاتا تھا۔ خوناک طوفان۔ ڈر کروہ صفیہ سے پرے ہتا۔ لیکن صفیہ اس کے قریب تر ہو جاتی۔ ”اب لو بھی“ صفیہ زبردستی چند پیسے اس کے ہاتھ میں تھما دیتی۔ مہندی کی بو سے رچے ہوئے پیسے کے ہاتھ کو کاشتے۔ ہتھی میں جلتی انگوٹھیوں سے بچنے کے لئے گھبرا کروہ نگاہ اور پاٹھاتا۔ صفیہ کا اتنا بڑا گورا چٹا چہرہ دیکھ کروہ پھر نگاہیں جھلکا لینے پر مجبور ہو جاتا۔ پھر اس کی نگاہیں صفیہ کی لمبل کی قمیض پر پھصل آتیں لمبل کی سفید قمیض دیکھ کر دفتار سے خیال آتا کہیں تربیہ سے وہ ابھری ہوئی ہے۔ شرم سے اس کی پیشانی پر پیسے کے قطرے ابھر آتے۔ ”تو بہہ تو بہہ ہے۔“ اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ”ایک سیر آلو اور دو پیسے کی پیاز۔“ وہ بہ آواز بلند و ہر اتنا جیسے وہ مشکل کشائی کا اسم اعظم ہو جس کا ورود کرنے سے وہ اس طوفان سے مخلصی پاسکتا ہو۔ اس غلاظت سے خود کو محفوظ کر سکتا ہو۔ پھر وہ بھاگ لیتا ”ایک سیر آلو۔ دو پیسے کی پیاز۔ ایک سیر آلو۔ دو پیسے کی پیاز۔ آلو ابھرتے

- پیاز چکلے کھل جاتے اور ممل کی شکل اختیار کر لیتے۔

”ایلی“ اس کی اپنی ماں ہاجرہ اسے آواز دیتی ”ڈونگے میں پانی لا دے“۔ وہ باور پھی خانے میں داخل ہوتا۔ ہاجرہ برتن مانجھنے آنا گوئند ہنے یا آلو چھینے میں مصروف ہوتی۔

”ماں۔“ وہ ماں کے قریب تر ہو جاتا۔ ”تم ہر وقت ان کا کام کیوں کرتی ہو؟“

”گھر کا کام جو ہوا۔ گھر کا کام کرنا ہی پڑتا ہے نا۔“

”گھر تو ان کا ہے اماں۔ پھر تم کیوں کام کرتی ہو؟“

”نہ بیٹا ایسی باتیں نہیں کر سکتے۔“

”اماں مجھے بھوک گئی ہے۔“

”کام ختم کر کے اپنا چولہا جلاوں لی نا۔“

”اتنی رات تو ہو چکی۔“

”بس ابھی ختم ہو جائے گا کام۔“

”اماں۔ ہمارا چولہا الگ کیوں ہے؟“

”اپنا چولہا الگ ہی ہونا چاہئے بیٹا۔“

”تو پھر تم دوسروں کا چولہا کیوں جلاتی ہو؟“

”فضول باتیں نہ کر،“ ماں چڑھ جاتی۔ ”جا آرام سے بیٹھ فرحت کے پاس ابھی آتی ہوں میں۔“

ایلی کو فرحت سے چڑھتی۔ وہ مگن بیٹھ رہتی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ وہ اس گھر کے ماحول سے قطعی بے پروا معلوم ہوتی تھی۔ اس کے لئے کوئی بات انوکھی نہ تھی۔ وہ دو چوہے دو گھروں کا کام کرنے والی ماں۔ وہ خونیں ہاتھوں والی صفیہ۔ اس کی ابھری ہوئی تمیض۔ سر کی ہوئی ابا کی دھوتی اور ان کا وہ بند کمر افرحت اس گھر میں یوں گھومتی پھرتی تھی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے وہ گھر اور اس کے افراد اس کی اپنی

دنیا سے تعلق ہی نہ رکھتے ہوں۔ ابا کے بند کمرے سے عجیب و غریب آوازیں سنائی دیتیں تو وہ چپ چاپ یوں اپنے کام میں مصروف رہتی جیسے بہری ہو۔ گھر میں فرحت کی طرف کوئی متوجہ نہ ہوتا تھا۔ نہ ابا سے کبھی بلاستے اور نہ صفیہ پوچھتی۔ البتہ اماں جب بھی فارغ ہوتی تو فرحت کے شانے سے شانہ جوڑ کر بیٹھ رہتی۔ دونوں باتیں بھی نہیں کیا کرتی تھیں۔ چپ چاپ بیٹھ رہتیں یوں جیسے بن بولے باتیں کر رہی ہوں۔ اس پر ایلی اور بھی غصہ آتا۔ اس قدر قریب کیوں نہ تھی ہیں۔ بات کے بغیر ایک دوسرے کے ساتھ یوں چلک رہتی ہیں۔ جیسے گوندے سے جوڑ رکھا ہو۔

اماں کے قرب کی وجہ سے وہ فرحت سے جلتا تھا اور اپنے آپ کو فرحت سے بہتر سمجھتا تھا۔ فرحت کی اس کھر میں حیثیت ہی کیا تھی نہ تو ابا نے اسے کبھی بلایا تھا۔ نہ اسے چلم بھرنے کے لئے کہا تھا اور ایلی کو تو وہ اکثر بلایا تھا۔ نہ اسے چلم بھرنے کے لئے کہا تھا اور ایلی کو تو وہ اکثر بلاستے تھے۔ وہ جب کھانا کھانے لگتے تو ”ایلی“ کو آواز دیتے ایلی اور جب ایلی جاتا تو دو انگلیوں سے بوٹی اٹھا کر اس کی طرف بڑھادیتے ”ایلی بوٹی“ اور ایلی اسے ہاتھ میں اٹھائے یوں اپنے کمرے میں داخل ہوتا جیسے کوئی تمغہ ہو۔ وہ فخریہ انداز سے فرحت کی طرف دیکھتا۔ لیکن فرحت یوں ناک چڑھا کر منہ پھیر لیتی جیسے ایلی کے ہاتھ میں گوشت کی بوٹی نہیں بلکہ مرا ہوا چوپا ہو۔ ہونہہ ایلی غصے سے پھنکا رتا ”بڑی آئی ہے۔ جیسے بوٹیاں کھا کھا کر اکتا چکی ہو۔“

پھر جب صفیہ پھلوں کی ٹوکری نکال کر انہیں چھانٹتی اور گلے گلے سڑے پھل الگ کرتی تو ابا ایلی کو آوات دیتے اور جب وہ ان میں سے کم گلاسٹر اکیلا یا سیب ایلی کی طرف بڑھاتے تو صفیہ بول اٹھتی۔

”لو یہ تو ابھی اچھا بھلا ہے۔“ یہ کہہ کروہ عجیب سی مسکراتی اس مسکراتی سے سارا کمرا بھر جاتا اور ایلی خود محسوس کرتا جیسے واقعی وہ پھل ابھی اچھا بھلا ہو اور

اس قابل نہ ہو کہ کسی کو دیا جائے۔ علی احمد حیرت سے صفیہ کی طرف دیکھتے اور پھر کھیانی نہیں کر دوسراے گلے سڑے پھاؤں سے چناؤ کرنے میں مصروف ہو جاتے۔

اگر کبھی ابا کوئی پھل فرحت کو دیتے تو وہ یہ یوں ایک طرف رکھ دیتی جیسے وہ کھانے کی چیز ہی نہ ہو۔

بڑا بنتی تھی فرحت اور اماں اس کی ان حرکتوں پر خفا ہونے کی بجائے خرا اور مرت سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی۔ اماں کی اس مسکراہٹ پر ایسی محسوس کرتا جیسے فرحت اور اماں نے چوری چوری آپس میں بھوتا کر رکھا ہو۔ اسے غصہ آتا کہ اماں اس سے سمجھوتے کیوں نہ کرتی تھی۔ اول تو ایسا اپنے حصے کا پھل رکھ دینے کا قائل ہی نہ تھا اور کبھی رکھ دیتا تو اماں پنجے جھاڑ اس کے پیچھے پڑ جاتی۔

”اے اب کہا بھی لے ایسے پڑا رہے گا خراب ہو جائے گا۔“ اماں یہ بات فرحت سے کیوں نہیں کہتی وہ سوچتا۔ وہ ہم سے ایک سایر تاو کیوں نہیں کرتی۔

فرحت کی بات چھوڑ دیئے خود صفیہ سے اماں کا برنا تو عجیب ساتھا۔ صفیہ گردن اٹھا چھاتی ابھارہا جرہ کے سر پر آ کھڑی ہوتی۔ ”ہاجرہ یہ کرو وہ کرو اور یہ تو تم نے ابھی تک کیا ہی نہیں اور وہ کام جو میں نے کل تمہیں دیا تھا وہ“۔ صفیہ کی باتیں سنتے ہوئے اماں کی عجیب حالت ہوتی۔ اس کی نگاہیں صفیہ کے چہرے پر گلی ہوتیں۔ جسم میں گویا جان نہ ہوتی۔ نس نس حاضر ہوتی۔ ایسی کوتوشک پڑتا تھا کہ اماں اس پر قربان ہوئی جا رہی ہے اور اس کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو یوں اٹھاتی جیسے قرآن شریف کا ورق ہو۔

اصفی محلے والیاں سب یک زبان ہو کر کہا کرتی تھیں۔ ہے ہاجرہ بیچاری تو مظلوم ہے۔ جسے سوکن کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن بہن سچ پوچھو تو ہمارے لئے تو گھر والی وہی ہے اور یہ کالے منہ والیاں جو گھر میں آ جاتی ہیں۔ ہمیں ان سے کیا۔

محلے والیاں بکتی تھیں صفیہ کا منہ کالا کھاں تھا۔ الشادوہ تو سرخ اور سفید تھا نہ صفیہ سوکن تھی۔ نہ اماں مظلوم۔ پھر وہ کیا تھیں اس الجھن کو جھون لئے لئے ایلی نیچے محلے کے احاطے میں اتر جاتا۔ اس کا اپنا گھر ایک معتمہ تھا۔ وہ مہندی والے ہاتھوں ململ کے ابھاروں والی صفیہ۔ سوکن کو محبت بھرنی نظروں سے دیکھنے والی باجرہ۔ صفتی بھری بوتی گولی فرحت اور بندگرے میں بیٹھنے کے شوقین علی احمد۔

صفتی محلے کے چوگان میں پہنچ کروہ اپنے گھر کو بھول جاتا تھا کے چوگان میں کھیلتے ہوئے اسے ابا کی آواز نہائی دیتی ایلی ایلی ابا کا حقد بھرنے کے بعد وہ ان کاموں سے بچنے کے لئے احاطہ چھوڑ کر علی اپور کے بازاروں یا کھیتوں میں چلا جاتا اور کھیل کھیل کر تھک جاتا تو کسی ورحت کے تلے بیٹھ کر سوچنے لگتا۔ ان کا گھر ایسا کیوں ہے۔ ابا ایسے کیوں ہیں۔ صفتی کون ہے۔ کھاں سے آئی ہے۔

علی پور

علی پور چھوٹا اور بے حد پرانا قصبہ تھا۔ اس کی وضع قطع وہاں رہنے والوں کی نفیات کی آئینہ دار تھی۔ قصبہ کے ارد گرد چاروں طرف ناک چندی اینٹوں کی فصیل بنی ہوئی تھی۔ جواب جگہ جگہ سے گری جا رہی تھی۔ جس میں جگہ جگہ بڑے بڑے شگاف پڑ چکے تھے۔ فیصل میں آٹھ دروازے اور دو موڑیاں تھیں۔ اس چار دیواری کے باہر گول مرٹک بنی ہوئی تھی جو قصبہ کے گرد گھومتی تھی۔ جس کے پرے سر سبز کھیتوں میں یہاں وہاں قدیم بامات کے شکنے مگر واضح آثار پھیلے ہوئے تھے۔ کچھی پگڈنڈیاں قرب وجوار کے گاؤں کی طرف نکل گئی تھیں۔ جہاں سے علی پور کا شہر یوں دکھائی دیتا تھا، جیسے قدیم عمارتوں کا ایک ڈھیر ہو۔

شہر کے اندر ناک چند اینٹوں کی بنی ہوئی سڑکیں گلیاں اور عمارتیں تھیں۔ بازاروں میں تنگ سڑکوں کے ارد گرد دکانوں میں تھیلیاں لٹکتی تھیں۔ مٹی کی ہنڈیاں نیچے اور پر رکھی تھیں۔ حکیم کی دوکان میں سیاہ رنگ کی بوتكوں پر زنگ آلو دیئن کے

ڈھکنے چڑھے تھے۔ جن پر کھیاں بجھنا تھیں۔ بازاروں سے نگ لگیاں گھومتی ہوئی نکل جاتیں۔ جن کے دونوں طرف چھوٹی اینٹوں کی دواریں ایستادہ تھیں۔ ان بو سیدہ رینگتی دیواروں میں کہیں کہیں اکا دکا کھڑکی کھلتی۔ نگ و تاریک کھڑکی۔ ان اوپر نچے تر چھے ناک چند مکانات کو دیکھ کر دیں پر ایک بوجھ سا پڑ جاتا۔ دیواروں پر بدر نگ ناک چند اینٹوں کو دیکھ کر سر میں دودھو نے لتا۔ طبیعت پر ان جانی اداسی چھا جاتی۔ یہاں وہاں آندھیری ڈیور ہیوں سے ویرانی جھانکتی۔ عیندیروں اور چھتوں پر سائے سے حرکت کرتے۔ جیسے بھوت پریت چل پھر رہے ہوں۔ لگیاں گھومتے گھومتے دغنا کے سے بند ہو جاتیں یا کل کے اختام پر محلے کا احاطہ شروع ہو جاتا۔ جہاں بچے فرش پر نگتے، عوارض جیسا کہ اتنے یا ازار بند بننے میں مصروف نظر آتیں یا کھڑکیوں سے سرکال کرایک دوسرا سے لڑتیں ہاتھ چلا کر کوئے دیتیں۔

قدیم شہر کی طرح علی پور بھی ایک ٹیلے پر آباد تھا۔ جس کے عین وسط میں ٹیلے کی چوٹی تھی۔ جس پر ایک مسارشde قلعے کے آثار تھے۔ جو شاید کسی زمانے میں شہر کی حفاظت کے لئے بنایا گیا تھا۔ اس اوپر نچے مقام کوئی کہتے تھے میں کے پاس ہی قبے کی عالی شان جامع مسجد تھی، جس کے قریب بڑا بازار تھا۔ جس میں کپڑے اور میاری کی دکانیں تھیں، بڑے بازار کے چاروں طرف گہری تاریک گلیوں کا جال بچا تھا۔ اور ان سے پرے شہر کی فصیل اور دروازے، اور اس سے پرے گول اور سر بنزکھیت، اور پرانے باغات کے مسارشde آثار۔

علی پور کے بازاروں میں لوگ دکانوں پر بیٹھ کر حقہ پیا کرتے، دنیاوی اور نہجی مسائل پر تبادلہ خیالات کرتے، کوئی اس اہم بات پر روشنی ڈالتا کہ شیخ عظمت بیگ کے گھر اولاد کیوں نہیں ہوتی، کوئی یہ نقطہ سمجھاتا کہ آصف علی کی بیگم دراصل کس خاندان سے ہے؟۔ ایک اس امر کی وضاحت کرتا کہ نورے جام کے پاس وہ کون سا بے نظیر نہیں ہے جسے وہ نگلوں کے حساب سے استعمال کرنے کو کہتا ہے۔ ایک یہ راز

فاش کرتا ہے کہ بابو سمیع کے لڑکے اعظم بیگ کی بیوی کی آنکھیں اتنی متكلم کیوں ہیں۔

نحو تمبا کو فروش کی دکان پر چوپٹ کا کھیل چلتا، بولے حکیم کی دکان پر شریعت سے متعلقہ مسائل پر گرم بحث ہوتی، معراج لٹکڑے کی دکان پر ترپ کی بازی کھیلی جاتی، اور چاند حلوانی کے تخت پوش پر آنے والے سیاسی وورکاٹز کرہ رہتا۔

ہر دکان پر ایک نہ ایک قسم کا خصوصی مجھ لگا رہتا۔ یہ لوگ جس نے جانے والے کو غور سے دیکھتے کہاں سے آیا ہے، کہاں جا رہا ہے؟۔ کیوں آیا ہے، کس لئے جا رہا ہے؟۔ اور اس کے بزرگ نہ جانے کے بعد ویرٹک ان تقاضیل پر اپنے رائے کا اظہار کرتے رہتے ہیں۔ اجنبی کی آمد پر چھپے تو اس کی نکائیں اس پر مرکوز ہو جاتیں ہیں، اور اس کا احاطہ کر لیتی ہیں۔ پھر اس کا تعاقب کرتی ہیں۔ ایک گروپ کی نگاہوں کی زد سے نکلنے کے بعد وہرے گروہ کی نگاہوں پر چڑھ جاتا۔ اس کے خدوخال، ملابس انداز، چال، گفتگو اور سرسری حرکات کا منفصل جائزہ لیا جاتا، پھر ان جملہ تفصیلات پر اظہار خیال کیا جاتا اور پھر تنقید و تبرہ کے بعد اس کی شخصیت اور طور اطوار پر آخری فیصلہ سنایا جاتا۔ جس کے خلاف اپیل کرنے کی گنجائش نہ ہوتی، اور جس کو بدلنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

اصفی محلہ

علی پور کے جنوب مغرب میں ہاتھی دروازے کے قریب بڑی ڈیوڑھی کے عقب میں اصفی محلہ تھا، جس میں ایلی کے عزیز و اقر بارہتے تھے، بڑی ڈیوڑھی کے پٹ زنگ آلوہ ہو چکے تھے۔ اور چولیں بے کار۔ ڈیوڑھی کی پیشانی پر دھنڈے حروف میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اندر ڈیوڑھی کے پہلو میں اصفیہ مسجد تھی جس کے قریب شاہ ولی کا مزار تھا۔ مزار سے آگے اصفی محلہ تھا۔ چاروں طرف چہار منزلہ مکان ایستادہ تھے، جن کے درمیان ایک وسیع احاطہ تھا۔ جس میں کمیٹی کی ایک خمیدہ لال

میں لگی ہوئی تھی۔ احاطے کے ایک طرف رنگ محل تھا۔ جس کے چونے پر گی دیواروں پر رنگ کے نقش و نگار کی بجائے میل جمع ہوا تھا، دوسرا طرف شیش محل تھا۔ جس میں نہ تو کوئی شیشه لگا ہوا تھا بلکہ دونوں کی وضع قطعی طور پر محل کی سی نہیں تھی۔ اس کے باوجود محلے والے انہیں رنگ محل اور شیش محل کہتے تھے۔ شیش محل کے نیچے ایک فراغ تھہ خانہ تھا، جس میں ایک مسجد اور ایک گنوان تھا۔

اس تہہ خانے کے متعلق مختلف نسخہ کی روایات مشہور تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ یہ تہہ خانہ بندے کے ہملوں سے بچنے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا، جب سلطانیہ سے شہر پر ہدہ بولتے تو ۲۴ صفحی محلے کے مردوں عورتیں، بچے تہہ خانے میں پناہ لیتے۔ مسجد میں نماز پڑھتے اور اپنی سلامتی کی دعا میں مانگتے۔ اور انہیں کا سختدا پانی پی پی کر اللہ کا شکر بجا لاتے،

محلے میں کئی ایک ڈیوڑھیاں اور کمرے ایسے تھے، جن میں سورج کی روشنی بھی داخل نہ ہوئی تھی۔ دوپہر کے وقت بھی محلے والے ہاتھوں سے ٹول کریا دیا سلامی جلا کر ان ڈیوڑھیوں اور کمروں سے گزر اکرتے تھے۔ ان پرانے محلات میں چونے کچے کمرے تھے، جن کی کھڑکیاں ایک زمانے سے بند پڑیں تھیں چھجھے خمیدہ ہو چکے تھے، کمروں میں جالے تھے ہوئے تھے۔ چھتوں میں چکاؤ ریس رہتی تھیں۔ اور خمیدہ دیواروں پر شگاف پڑ چکے تھے، ان مکانات میں نہ انکشافت ہوتے رہتے تھے، کسی اندھیرے کمرے میں کسی بوسیدہ صندوق سے کوئی قلمی مسودہ برآمد ہو جاتا۔ کسی چونے پر گھپے ہوئے طاق کا پتہ چلتا۔ شاید اسی وجہ سے ہر آصفی کے دل میں ایک ایک مزید چھپے ہوئے طاق کا پتہ چلتا۔ شاید اسی وجہ سے کسی دلبھ کے دل میں ایک پر ایویٹ خیال جان گزیں رہتا، کہ محلے کے کسی نہ کسی کونے میں کہیں نہ کہیں دبا ہوا خزانہ موجود ہے۔ لیکن ہر آصفی نے اس امید افراد خیال کو دل میں چھپا رکھا تھا، وہاں کسی دلبھ کے دل میں ایک مزید چھپے ہوئے طاق کا پتہ چلتا۔ کیونکہ سب جانتے تھے کہ جب

اٹھی برس اقتدار تھے تو ان کی تنخواہ سرکاری خزانے سے گدھوں پر لد کر آتی تھی۔

پرانے زمانے میں اصفیوں کی عظمت مسلم تھی، لیکن اب وہ باقی مغض قصے تھے، خوش کن تھے، اب اٹھی اور ان کے رنگ محل اور شیش محل کے اردوگرد ہنسنے والے خدمتگار اور لیکین سب خلط ملاط ہو چکے تھے۔ سارے محلے میں چند افراد ایسے تھے، جو مکتب سے تحصیل یافتہ تھے، اس لئے زیادہ تر اصفیوں کا شغل دو کامداری، ہزاری، اور بے گاری پر مشتمل تھا، یہ اصفیوں کے انحطاط کا زمانہ تھا، اس لئے وہ اپنی عظمت کا احساس پدرم سلطان بود سے کرتے تھے، گزشتہ جاہ و حشمت کی کہانیاں ان کے نزدیک جال کی فارغ الیابی سے کہیں زیادہ وقت رکھتی تھیں۔ جنہیں سنانے میں اٹھی محلے کی بوڑھیاں محل سے کام نہیں تھیں۔

علیٰ احمد

ایلی کے والد علی احمد کا گھر محلے بھر میں بڑے گھر انوں میں گنا جاتا تھا، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ محلے بھر میں علی احمد واحد شخص تھے، جنہوں نے چودہ جماعتوں تک تعلیم پائی تھی، اگر چوہلی، اے کی ڈگری حاصل نہ کر سکے تھے، لیکن اس زمانے میں لی، اے فیل ہونا بڑی بات تھی۔ لی۔ اے میں فیل ہونے کے بعد علی احمد کو ایک معقول اسمی مل گئی تھی، اور اس اسمی کی وجہ سے محلے بھر میں ان کی عزت تھی۔

اپنے والد کی طرح علی احمد کی طبیعت میں بھی عاشقانہ چمک کا غصر تھا، لیکن ان کی طبعی نہیں مزاجی اور جرات رندانہ عاشقانہ غصر پر حاوی رہتی، جو انہیں آئیں بھرنے اور فراق میں رہنے کی بجائے جینے کی طرف مائل رکھتی تھی، دراصل علی احمد کو افراد کی بجائے زندگی سے عشق تھا۔

علی احمد کا قد درمیانہ تھا، بدن چھریا، رنگ سانوالا ان کی پیشانی فراخ تھی۔ خدا و خال میں کوئی خصوصی جاذبیت نہ تھی۔ مگر اس کے باوجود نہ جانے اس فراخ پیشانی

میں ان سادہ سیاہ آنکھوں میں یا جانے کہاں وہ بے نام اڑتا، جسے محوس کر کے راہ چلتی عورت اپنے راستے سے بھلک جاتی۔ اس کے پاؤں آپ ہی آپ ٹھیکنے لگتے، پلوس سے سرک کر شانوں پر جاگرتا۔ پھر بر قعے کے پٹ کھلتے اور ایک بڑی سی چمکیلی آنکھ طاوع ہو جاتی۔

علیٰ احمد کی چال میں ایک خصوصی جاذبیت تھی۔ ان کے شانے کبھی خم سے آشنا نہ ہوئے تھے، ان کی چھاتی تین رہتی، نگاہیں ہمیشہ اور پر کو الہی رہتیں، وہ دیکھ کر راہ چلنے کے عادی نہ تھے، بلکہ انہیں راہ چلتے ہوئے دیکھنے میں دل پھی تھی۔ علیٰ احمد کے انداز میں ایک وقار تھا، ان کی طبیعت میں ملن سلاسلی کے علاوہ ایک رنگینی تھی، گفتار میں شوغی اور شراحت تھی، اور ان کی نگاہوں میں فصرت اور کام یا بیکا کا پیغام جھلکتا تھا۔

بیویوں کے متعلق علیٰ احمد کے خیالات نتوں محدود تھے اور نہ ہی رسمی، انہیں بیویوں سے یہ گلہ تھا، کہ انہیں جلد ہی عام ہو جانے کی عادت ہوتی ہے۔ چاہے کتنے ہی چاؤ چونچلوں سے بیاہ کر لاؤ۔ کتنے ہی رکھر کھاؤ سے رکھو، لیکن جلد ہی وہ باور پی خانے میں پیٹھی ہو چھیل رہی ہو گی، یا راکھ بھرے چوہے میں پھونکیں مار رہی ہو گی۔ اس طرح چند ہی روز میں وہ بیوی سے باور چن ہو کر رہ جائے گی، بیوی کی اس بری عادت کے خلاف انہیں بہت شکایت تھی۔

والدین نے چھوٹی عمر میں ہی علیٰ احمد کو حاجرہ سے بیاہ دیا تھا، ابھی وہ جوان ہی تھے کہ ان کے گھر میں دوپچ بھی ہو گئے۔ بڑی لڑکی فرحت اور چھوٹا ایلی، ایلی کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد علیٰ احمد کے سر سے اس کے دادا اولاد علیٰ کا سایہ اٹھ گیا، اس وقت علیٰ احمد جوان تھے، بر اقتدار تھے۔ اور اپنی پیشانی اور رنگیں نگاہوں کے بے نام سحر سے بخوبی واقف تھے، ان کے گرد و پیش ایک حسین و دل کش دنیا پھیلی ہوئی تھی، اور دل میں تسبیح کا بے پناہ جذبہ موجود تھا۔

علیٰ احمد کو ہاجرہ سے چند اس دل چھپی نہ تھی، اس کی کئی ایک وجہات تھیں، اول تو حاجرہ کے نام میں اتنی تقدیمیں تھیں، ایسی مقدس نام کی لڑکی سے کوئی شوخ یا رنگیں قسم کی حرکت کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ وہ مرے اعمال کے لحاظ سے بھی وہ حاجرہ ہی تھی، اس نے حاجرہ کا نام ہی علیٰ احمد کے رنگیں مزاج پر بار تھا۔ جسمانی طور پر بھی وہ چند اس قابل قبول نہ تھی، قد چھوٹا بناؤٹ میں زدا کت کا غصہ قطعی طور پر مفتوہ۔

ہاجرہ ان بیویوں میں سے تھی، جو خاوند کی آمد پر تسلیم و رضاکی شدت سے بے جان ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے بعد علیٰ احمد کو عمل تغیرے سے مشق تھا۔ اور تغیر جب ہی ممکن ہے، جب سرشی کا غصہ غالب دکھانی دلتے۔ چاہے وہ فریب نظر ہی کیوں نہ ہو؟۔ جو تغیر کے جذبے کو اچھا رہے، تغیر اُن نے والے کو مائل بہ عمل کر دے، اور پھر مطمئن کرنے چل نکلے، وہ اپنی ایجادہ چال، انہری ہوئی چھاتی، فراخ پیشانی، اور رنگیں ختم نہ گاہوں سے مردانہ و ارتغیر کرتے، پھر تخلیے میں ڈان کو ہٹے کی سی پر جوش لڑائی لڑنے کے بعد اس میدان کا رزار کی دلیز پر بچے کی طرح اس امید پر گر پڑتے، کہ انھیں کوئی شفقت بھرا ہاتھ تھپک تھپک کر سماوے۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت کے جملہ پہلوؤں پر حاوی تھا، اس نے یہ آمیزش درحقیقت ان کی تمام تر زندگی کا تاریخ پوچھا، بچہ ٹینک اسپا ہی۔ جنگجو، سورما۔

جنہی پہلو کے علاوہ علیٰ احمد میں مجلسی زندگی کی جملہ صلاحیتیں موجود تھیں، ان کی گفتگو میں مزاج کی شیرینی تھی۔ اطاائف اور روایات کے علاوہ انہیں شجرہ نصب اور دیگر تاریخی واقعات کو بیان کرنے میں بے حد مہارت تھی۔ محفل میں وہ اپنے تاریخی علم کا اظہار کچھ اس انداز سے کرتے، کہ ذرا کوفت نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ انہیں لکھنے سے عشق تھا۔ اپنا بیشتر وقت وہ لکھنے میں صرف کرتے تھے، شاید یہ اصفیوں کی قسم تھی شاید یا خوش قسمتی ہو کہ ان کی توجہ تصنیف و تالیف کی طرف مائل نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علیٰ احمد یہ قابلیت گھر کا حساب اور پیدائش و موت کی تاریخوں کے نوٹ

کرنے پر محدود ہو کر رہ گئی۔ لیکن نظر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ کام بھی ایک بہت بڑی مصروفیت تھا۔ علی احمد کے ڈیک پر بڑے بڑے خیم رجسٹر پرے رہتے ہیں جن کے ساتھ المونیم کی تھاں میں ایک دوات اور دو موٹی نبوں کے قلم رکھے رہتے ہیں۔ اپنی مخصوص میلی اور پھٹی ہوئی وھتوں پہن ان قمیض اتنا کر کمبل یا چٹائی پر اکثر وہ بیٹھ کر وہ فرصت کے اوقات میں ان بھاری بھر کم رجسٹروں میں مختلف نوعیت کے اندر اراج کرنے میں شدت سے مصروف رہا کرتے تھے۔

علی احمد کے گرد ازیں روپے پیسے کی احتیاط کا پہلو بے حد اہم تھا۔ وہ پیسوں کو احتیاط سے رکھتے تھے، اور زبردست کے خرچ لاکوشول خرچ کے متراوف سمجھتے تھے، حتیٰ کہ عورت پر بھی روپی خرچ کرنے کے قائل نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عورت تو تین کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز وعدے ہیں، روپے کا تصرف نہیں، ان کا ایمان تھا کہ عورت کی خوشی حقیقت سے تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ محسن تخلیل سے وابستہ ہے، اور اسے روپے پیسے جیسی مادی چیز سے کوئی تعلق نہیں۔

نوجوانی میں ہی علی احمد کو عظیم الشان کامیابیوں سے ہم کنار ہو چکے تھے، ابتدائی دور میں چانناں کے التفات نے ان میں خود اعتمادی کی بنا ڈالی تھی، پھر صفیہ کی ڈرامائی شکست نے تو انہیں ہیر و بنا دیا تھا۔

صفیہ

صفیہ شام کوٹ کی ایک میار تھی، اس کے سرخ و سپید چہرے پر عجب و قار تھا۔ اس کا لانا قدر، کشاورہ پیشانی، اور ایتا وہ چال دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے قدرت نے شام کوٹ میں ایک قلوپڑہ پیدا کر دی ہو، صفیہ کو دیکھ کر علاقے کا پولیس اسپلٹر شہاب الدین اپنے اوس انکھوں پر بیٹھا تھا، لیکن پولیس کا اعلیٰ آفیسر ہونے کے باوجود وہ شام کوٹ کی اس حسینہ کو اپنی جانب متوجہ نہ کر سکا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہاب الدین کے دل میں صفیہ کی آرزو نے عشق کا رنگ اختیار کر لیا۔ اور عالم مجبوری میں وہ صفیہ کو

انواع کرنے پر مجبور ہو گیا۔ چونکہ شہاب الدین کے ذرائع و سعی تھے اس لئے وہ صفیہ کو لے کر امر تر پہنچ گیا، اور اسے اپنے موروثی مکان کے دیوان خانے میں بٹھا کر خود والدین کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے اندر رگیا، تاکہ صفیہ کے لئے اپنے مکان میں دائمی جگہ پیدا کر سکے۔

علیٰ احمد اسی وقت اتفاق سے اپنے دوست شہاب الدین سے ملنے اس کے مکان پر جا پہنچ، صفیہ کو دیکھ کر وہ بھونچ کرہ گئے، صفیہ کی بیوی پرواح اور بھرپور جوانی نے ان کی قوت تغیر کو ملکا را ہنے جانے اس ختنہ سے وقفہ میں شہاب الدین کے دیوان خانے میں بین کے پاہی نے اس سرخ اور غیدہ میار کو کیا جو ہر دکھائے کہ شہاب الدین کی آمد سے چنانچہ صفیہ علیٰ احمد کی ہو گئی، اور ایک بچے کی طرح علیٰ احمد کی انقلی پکڑ کر دیوان خانے سے باہر نکل گئی۔

اصفی محلے میں صفیہ کو چھپائے رکھنا مشکل کام نہ تھا، اس لئے پولیس کی صفیہ کو ڈھونڈنے کی کوششیں اکارت گئیں، اور صفیہ پچکے سے علیٰ احمد کی بیوی بن گئی۔

صفیہ کے آنے پر محلے میں کافی ہل چل پیدا ہوئی، مگر بے چارے محلے والے معمولی احتجاج کے علاوہ اور کرہی کیا سکتے تھے، حاجرہ اس نئی آمد پر سٹ پٹائی، روئی بیٹھی۔ لیکن حاجرہ کی سنتا ہی کون تھا، اس کے علاوہ وہ خوب جانتی تھی کہ علیٰ احمد کے گھر میں اس کی حیثیت ایک نوکرانی سے زیادہ کی نہ تھی، چاہے صفیہ آتی یا نہ آتی، اس لئے وہ جلد ہی خاموش ہو گئی۔ علیٰ احمد کی والدہ جانتی تھی کہ بیٹا اپنے باپ کی طرح جذباتی واقع ہوا ہے۔ خاوند کے جذبہ محبت کی وجہ سے اس نے عمر بھر رہا پے میں بسر کی تھی، وہ ڈرتی تھی کہ کہیں بیٹا بھی اسی جذبہ کے تحت اسے داغ مفارقت نہ دے جائے۔ اس لئے وہ بھی چپ چپ ہو رہی کہ چلو بیٹے کے صدمے کی نسبت دوسرا بہو کا گھر میں آنار انہیں، محلے والے بھی خاموش ہو رہے کیونکہ صدائے احتجاج بلند کرنا تو آسان تھا۔ لیکن اسے قائم رکھنا مشکل تھا۔ انہیں صرف یہ گلہ تھا کہ صفیہ شام

کوٹ کی ترکھانی تھی، ایک ترکھانی کا صفیوں میں آشامل ہونا تکلیف وہ امر تھا، مگر اس کا کیا کیا جائے کہ شریعت اس عمل کی اجازت دیتی تھی، اور کھلے بندوں شریعت کے خلاف آواز اٹھانا مناسب نہ تھا۔

صفیہ کے آنے ہر ہاجرہ کی دینیت شخص ایک نوکرانی کی سی رہ گئی، اس وقت ہاجرہ کی گود میں ایلی تھا وہ ایک نجیف وزن اربپچھہ تھا۔ اکثر بیمار رہتا۔ ہاجرہ کے لئے یہ بھی بہت تھا کہ اس کے پاس فرحت اور ایلی تھے جن کے سہارے وہ زندگی بسر کر سکتی۔ اس نے اس کی تمام تر توجہ ایلی کے علاج معا الجے کی طرف مبذول ہو گئی۔ ایل زندہ رہے۔ ایلی صحت ہو جائے تو چاہے گھر میں بیسیوں صفائی میں آجائیں۔ پڑی ایں۔ اپنے نصیب میں بہن مقدار کے خلاف کیا شکوہ۔ ہاجرہ کے آنسو خشک ہو گئے۔ اس کے بالوں اور روپے سے عطر کی خوبصورتی کی بجائے ہسپتال کی آیوڈین اور پنساری کے کثراً مل کے بو آنے لگی۔ اس کے خیالات میں اپنے گھر کی بجائے ایلی کی طرف دیکھا اور فرط محبت سے اس کے قریب تر ہو گئی۔ نسخی فرحت حیران کھوئی کھوئی نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ ہاجرہ فرحت اور ایلی یہاں کی دنیا تھی۔ ہاجرہ ایلی کی طرف دیکھتی رہی فرحت ہاجرہ کا سہارہ ڈھونڈتی رہی اور ایلی بس نگاہوں سے چھپت کی طرف دیکھا کیا اور ساتھ وائے کمرے میں روغنی کجری اور ٹین کا سپاہی محبت کا میدان جنگ گرمانے میں مصروف رہے اور علی احمد کی بوڑھی ماں جائے نماز پر یوں بیٹھی رہی جیسے کچھ نہ سر رہی ہو، کچھ نہ دیکھ رہی ہو۔

انوکھا انقام

ایلی جئے گیا بچپن کی لمبی بیماری کے چنگل میں پڑا وہ آخری سانس لیتا رہا۔ مگر لیتا رہا، اس کی لاغری اور ناتوانی کی وجہ سے بیماری اسے ہلاک نہ کر سکی اور بالآخر چھوڑ گئی۔ وہ رو بصحت ہونے لگا۔

ہاجرہ نے اسے روپہ صحت ہوتے دیکھا تو اس کے دل سے ایک بوجھا تر گیا۔ ایلی زندہ رہے گا۔ ایلی کی طرف سے مطمین ہونے کے بعد ایک بار پھر ہاجرہ کی توجہ اپنے لئے ہوئے سہاگ کی طرف مبذول ہو گئی۔ خاوند کے لئے جودبی چھپی محبت اس کے دل میں تھی وہ پھر سے ابھر آئی لیکن اظہار کو کون روک سکتا ہے۔ اصلی روپ میں نہ کسی، کسی بھروسہ میں نہیں۔ ہاجرہ کے دل میں بھڑکتی ہوئی پیاری آگ نے نفرت کا روپ دھار لیا تاکہ اظہار تو ہو سکے۔ لیکن نفرت جتنا کا بھی کوئی ذریعہ نہ تھا وہ خود علی احمد کی میمان تھی۔ اس کی نفرت یا محبت کو کون خطر میں لا تباہ۔ وہ بیچاری کر دی کیا سکتی تھی اور اظہار تو بھی اظہار ہوتا ہے جب وہ مرد اسے محسوس کر دیں۔ ہاجرہ نے اسی اظہار محبت یا نفرت کا ایک انوکھا طریقہ ایجاد کر لیا۔ ایسا انوکھا طریقہ جو صرف عورت ہی سوچ سکتا ہے جسے عمل میں لانے کی وجہ سے صرف عورت ہی کر سکتی ہے۔ اس نے اپنی سوکن صفیہ سے عشق لگالیا۔ اس لئے کہ اس طرح وہ علی احمد کی حریف بن سکتی تھی اسے رقبہت کی آگ میں جلا سکتی تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ علی احمد کے گھر کی نوکرانی بھی نہ تھی۔ عشاق نوکر نہیں ہوتے۔ اگر صفیہ کے دل میں ہم جنسی کا ذرا سا بھی پہلو ہوتا تو ہاجرہ کی کامیابی یقینی ہو جاتی اور علی احمد ہاجرہ کے وجود کو ماننے پر مجبور ہو جاتے لیکن ایسا ہونا تھا نہ ہوا۔ صفیہ اپنے فطری مردانہ جاہ جلال کے باوجود اپنی سر شست میں ہم جنسی کا پہلو نہ رکھتی تھی۔ اس لئے ہاجرہ کے اس انوکھے تسلیم و رضا کے جذبے کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹ جھلکنے لگی۔ اچھا تو میں آزمادیکھوں۔ اس نے سوچا اور وہ ہاجرہ کو آزمائنے کے دلچسپ مشغله میں کھو گئی۔

ہاجرہ قدم آگے اٹھا چکی تھی اب وہ پیچھے نہ ہٹ سکتی تھی۔ صفیہ کیا کہے گی کہ وہ اظہار محبت محض ایک دکھلاواتھا۔ اس خیال سے ہاجرہ کے احساس خودداری پر ٹھیک لگتی تھی اس لئے وہ اندھا و دنداس را پر آگے بڑھنے لگی۔ ایک قدم اور شاید اب صفیہ کو

یقین آجائے ایک قدم اور شاید اب صفیہ قائل ہو جائے۔ وہ آگے بڑھتی گئی۔ صفیہ کی جانب قدم اٹھاتی گئی اور فرحت اور ایلی پیچھے رہتے گئے۔ ”صفیہ صفیہ“ ہاجرہ کی آواز میں وہ للاکار تھی جو صرف احساس شکست ہی پیدا کر سکتا ہے۔ ”صفیہ دیکھو۔ صفیہ۔“ دور ایلی پڑا چارپائی پر رو رہا تھا۔ فرحت گریا کہیتے کھلتے اکتا گئی تھی۔ گھر کے اس چھوٹے سے ویران کمرے میں جو ہاجرہ کے لئے مخصوص تھا۔ فرحت اور ایلی تہارہ گھنے۔

نزا امتحان

باور پچی خانے میں ہاجرہ صبح و شام صفیہ کی خوشبوی کے لئے معروف کا رہتی۔ صفیہ پھولدار پینگ پوش پر بظاہر بے نیاز بیٹھی علی احمد کا انتظار کرتی اور علی احمد گھر سے باہر اپنی قوت تغیر کے امتحان میں معروف رہتے۔ ہاجرہ کے کمرے میں ایلی اور فرحت رو رو کر بھوکے سو جاتے۔ پھولدار پینگ پر بیٹھے بیٹھے صفیہ انتظار اکتا کر چلاتی۔ ہاجرہ جب تک وہ نہ آئیں، تم باور پچی خانے سے نہیں جانا سونا نہیں۔“ اور ہاجرہ چوکی پر بیٹھی انتظار کرتی کہ کب علی احمد آئیں اور انہیں کھانا کھلانے سے فارغ ہو کر اپنا چولہا جلائے۔ ایلی اور فرحت کے لئے چاول پکائے۔

علی احمد و اپس آتے تو چپکے سے دبے پاؤں اپنے کمرے میں داخل ہو جاتے تاکہ صفیہ کو معلوم نہ ہو کہ وہ اتنی دری سے لوٹے ہیں۔ لیکن ان کی آہٹ پا کر صفیہ جاگ اٹھتی۔ وہ علی احمد سے بگڑتی۔ علی احمد اسے مناتے لیکن وہ بگڑے چلی جاتی۔ پھر کمرے سے دھینگا مشتی کی آوازیں آنے لگتیں چونکہ معاملے کی زناکت دیکھ کر ڈان کوہنے میدان میں آنکھتی۔ ٹین کا سپاہی اپنے داؤ دکھاتا بالآخر شام کوٹ کا وہ مضبوط مگر حسین قلعہ سر ہو جاتا اور صفیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ علی احمد خوب جانتے تھے کہ ٹین کا سپاہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاسکتا ہے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آجائے تو ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہاجرہ کو آواز دی جاتی۔ ہاجرہ

کھانا کھلاؤ۔ کھانا کھانے کے بعد ٹین کا سپاہی تازہ دم ہو کر پھر سے میدان کا رزار میں شام کوٹ کے قلعے کو للا کرتا اور ہاجرہ پچکے سے اپنا چواہا جلا کر سونے ہوئے بچوں کے لئے کھانے پینے کا سامان تیار کرنا شروع کر دیتی۔

پھر صفیہ کو ایک نئی بات سوچی۔ ایک نیا متحان۔ ”ہاجرہ“ صفیہ بولی! ”دیکھو تو میری بانہوں میں سونے کے لئے ہوں تو کیسار ہے۔ وہ آنکھ بچا کر مسکرائی۔ اسی دن ہاجرہ کی زندگی میں ایک نئی بات پیدا ہو گئی روپیہ بچانا۔ صفیہ کے کڑوں کے لئے روپیہ بچانا۔ صفیہ کے لئے تمہیں کپڑے مہیا کرنا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہاجرہ صفیہ کو اپنا نہ سکتی۔ صفیہ فرحت اور ایلی کو دیکھ کر خوش نہ ہوتی تھی انساں کی تیوری چڑھ جاتی۔ لگا ہیں خشکیں ہو جاتیں کیونکہ اس کے اپنے بیہاں کوئی بچہ نہ تھا۔

علیٰ احمد کبھی بھارجیرانی سے ان دو بچوں کی طرف دیکھتے جیسے ان کے وجود سے پہلی مرتبہ اتفاق ہو رہے ہوں۔ انہیں یاد آتے کہ وہ ان کے اپنے بچے ہیں اور پھر وہ بچے خواہ مخواہ ان کو اچھے لگتے اور وہ کھانا کھاتے ہوئے آواز دیتے۔ ”ایلی۔ بیہاں۔ بیہاں آؤ ایلی۔ یہ لو بولی۔“ جسے ہاتھ میں پکڑ کر ایلی وہ بے حد سرور ہوتا اور یوں خبر سے اٹھائے پھرتا جیسے وہ تمغہ ہو۔

ہاجرہ اس بات کا خاص خیال رکھتی تھی کہ بچے یہ محسوس نہ کریں کہ جو چیزیں علیٰ احمد اور صفیہ کو میر تھیں، وہ انہیں نصیب نہیں۔ اس لئے وہ انہیں ہر قسم کی تھوڑی تھوڑی چیز منگوادیا کرتی تھی۔ اگر علیٰ احمد کے لئے پلاو تیار ہوتا تو وہ انہیں نمکین چاول پکا دیا کرتی اور کہتی ”لو یہ بہترین قسم کا پلاو ہے اور ایلی اور فرحت خوشی خوشی وہ بہترین قسم کا پلاو کھاتے۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ دیکھتے کہ ان کی ماں گھر میں برتن مانجھنے اور صفیہ کا کھانا پکانے میں صبح و شام مصروف رہتی ہے اور صفیہ کو پلنگ پر بیٹھ کر حکم چلانے کے سوا اور کوئی کام نہیں تو وہ محسوس کرتے کہ ان کی ماں محض نوکرانی ہے اور علیٰ احمد ان کے آقا ہیں۔ ابا نہیں۔

صفیہ کے آنے پر علی احمد کو وہ آزادی نہ رہی تھی۔ تجیر کا شوق تو ان کے دل میں جوں کا توں قائم تھا۔ لیکن اس کے موقع کم ہو چکے تھے۔ دو ایک مرتبہ انہوں نے عورتوں کو گھر بلانے کی کوشش کی تھی لیکن صفیہ اس بات کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ علی احمد کو مجبوراً پنی اس دلچسپی کو گھر سے باہر تک ہی محدود رکھنا پڑا۔ اب وہ راتیں باہر گزارنے لگے اور آدمی آدمی رات گئے گھر آنے لگے تھے۔ صفیہ نے اس پر صدائے احتیاج بند کی۔ لیکن علی احمد صدائے احتیاج سے نہ ڈرتے تھے کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ صفیہ کی بڑی سے بڑی صدائے احتیاج کو ٹین کا سپاہی مسکراہٹ میں پرال ملتا ہے۔

All rights reserved
☆☆☆
© 2002-2006

مہندی رنگے ہاتھ

ایلی بڑا ہو جاتا جا رہا تھا۔ اگر دوپیش کے حالات کو سمجھے بغیر ان سے متاثر ہو رہا تھا۔ پنگ پر بیٹھی ہوئی صفیہ کی توجہ کامر کرن بنی جا رہی تھی۔ وہ صفیہ جس کے مہندی ارچے ہاتھ ہر وقت حرکت میں رہتے تھے۔ جس کے ہاتھوں کی میلی زرد انگوٹھیاں گھومتی تھیں۔ جس کی مہین ململ کی قمیض ہر وقت ابھری رہتی تھی۔ وہ صفیہ..... جس کے حکم کو بجالانے کے لئے اس کی ماں ہر وقت کمر بستہ رہتی تھی۔ جس نے ماں کو پھوں سے چھین لیا تھا جس نے اس کے پا پی کو اپنے جادو کے زور سے مین کے سپاہی میں تبدیل کر رکھا تھا۔ وہ صفیہ اس سفیہ سے ڈرتا تھا اس کے خون میں ہاتھوں سے ڈرتا تھا۔ اس کے بالوں کے جونڈے سے ڈرتا تھا۔ اس کی مہین قمیض سے ڈرتا تھا۔ چوری چوری اس کی طرف دیکھتا اس کی بے نام طاقت کو محسوس کرتا۔ جسم کے بال کھڑے ہو جاتے۔ کانوں کی لویں گرم ہو جاتیں۔ تنفس تیز ہو جاتا پھر اس کی روح کی گہر واںیوں سے ایک طوفان اٹھتا۔ صفیہ کے خون سے بھیگے ہوئے ہاتھ اس کی طرف لپکتے۔ زرد میلی انگوٹھیاں گھومتیں۔ اس کا سر چکرانے لگتا طبیعت ماش کرنے لگتی اور وہ دیوانہ وار بھاگتا۔ دور صفیہ کے کمرے سے دو رآن تمام چیزوں سے جنمہیں صفیہ کے خون آلو دھاتھوں نے چھوا ہو۔

صفیہ کو معلوم تھا کہ ایلی مہندی والے ہاتھوں سے چڑھتا ہے اور انگوٹھیوں سے گھن کھاتا ہے۔ اس لئے وہ جان بوجھ کر ہر کھانے کی چیز کو ہاتھ لگا دیتی تھی اور اسے آواز دیتی: ”ایلی یہ لومٹھائی۔۔۔“ اور پھر مٹھائی کو اپنے ہاتھوں سے اچھی طرح مسل کر اسے دیتی۔ ایلی اسے یوں کپڑتا جیسے وہ مٹھائی نہیں بلکہ چوہا ہو اور پھر اپنے کمرے میں آ کر غصہ سے کھولتا۔ ”بڑا بد دماغ ہو گیا ہے تو“ صفیہ اسے ڈانتی۔ کیا ہے۔ ”مہندی رنگے ہاتھ کو۔ یہ دیکھا ایسے اچھے لگتے ہیں۔ مہندی لگے ہاتھ۔ دیکھ

تو،“ وہ اس کے منہ پر ہاتھ مل دیتی اور ایلی آؤ آؤ کرتا بھاگتا اس کی ناک میں مہندی کی بو بس جاتی۔ میٹھی میٹھی نگے پنڈے کو بو، اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا گردو پیش میں انجانی پچکاریاں چلتیں۔ برہنہ صورتیں چاروں طرف سے یورش کرتیں۔ آخر ححو۔ آخر ححو۔

صفیہ نے ایک دن ایلی کو ستانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب وہ سورہ باتھا تو اس کے ہاتھ پر مہندی مل کر اسے باندھ دیا۔ باجرہ نے منتیں کیسیں۔ ”نه صفیہ سے پچھنا کہہ۔“ صفیہ بولی۔ ”مہندی ملنے سے کیا ہوتا ہے۔ خواہ جنواہ کا پاکھنڈ مچا رکھا ہے اس اڑکے نے۔ دیکھو کیا کرے گا۔ اپنا یا تھکات کر پھینک دئے گا کیا۔“ یہ سن گرہ باجرہ خاموش ہو گئی۔ وہ بیچاری خود مجبور تھی۔ جب آگے روز ایلی جا کا اپنا مہندی رنگ کا ہاتھ دیکھ کر اس نے سر پیٹ لیا۔ جسم کے بند بند سے میٹھی میٹھی بو آرہی تھی۔ نگاہ میں ہر چیز سرخ دکھائی دے رہی تھی۔ اس روز اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ننگا ہو۔ جیسے اس کا جسم غلاظت سے لتر رہا۔ باہر صحن میں سفید ململ کی باریک کرتی پہنچے صفیہ کھڑی بال بناتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ نہ جانے ایلی کو کیا ہوا۔ اس کی نظر میں وہ سفید کرتی سرخ دکھائی دیئے گئی۔ سرخ، خونیں سرخ۔ جیسے وہ تمیض مہندی سے رنگی ہو۔ وہ بھاگا۔ لپکا اور آن کی آن میں صفیہ کی کرتی پر پل پڑا۔ اس کے ناخون سفید ململ میں دھنس گئے۔ تمیض کی وجہیں صحن میں اڑانے لگیں۔ ”مجھے بڑا ہو لینے دے۔ مجھے دویں پاس کر لینے دے پھر۔ پھر۔“ وہ دیوانہ وار چلا رہا تھا۔ نہ جانے بڑے ہو جانے کو اس نگے پنڈے کو بو اوہ ہمیں تمیض سے کیا تعلق تھا نہ جانے دویں پاس کر لینے کو اس سرخ رنگ سے کیا تعلق تھا۔ مگر وہ اپنی دھن میں سوچے سمجھے بغیر چھٹا چلاتا رہا ململ کی وجہیں کو بکھیرتا رہا۔ اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں گویا اہل کر باہر نکل آئی تھیں۔ جسم کا نپ رہا تھا۔ ”ہا۔“ وہ چلایا۔ ”بڑا ہو جاؤں پھر۔“ اس کے حلق میں آواز سوکھی۔

صفیہ حیران کھڑی تھی سمجھے میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ پھر ایلی بھاگ گیا۔ گھر سے

باہر۔ دیوان خانے سے باہر۔ سکول میں جا کر چھپ گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ جرم کا مرٹک ہو چکا ہو۔ جیسے وہ اپنے اس فعل کی وجہ سے ننگا ہو گیا ہو۔

”ہوں۔ تم یہاں ہو۔“ سارے دن کی تلاش کے بعد علی احمد نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ ”چلو گھر چلو۔ چلو،“ اور وہ گھر کی طرف چل پڑے۔ گھر پہنچ کر علی احمد نے اس کے کپڑے اتر واوی یہ تعمیض پائی جامہ جوتے اور اسے گھر سے باہر نکل کر اندر سے دروازے کی لندھی چڑھا دی۔

گلی ویران پر کی تھی لیکن ایلی محسوس لبر رہا تھا جیسے لوگ گھر کیوں کے پیچھے سے چھپ کر اسے دیکھ رہے تھے۔ منڈیر والے پیچھے کھڑے نہیں رہے تھے۔ منڈیر پر بیٹھا ہوا کواشور مچا رہا تھا۔ تنبیہ لگا رہا تھا۔ پھر زینکانگلی کے ناک چندی اینٹوں کے فرش پر پاؤں کی چاپ گئی۔ کوئی آرہا تھا اسے یوں لگا۔ جیسے کسی نے اس کے سر پر ہتھوڑا دے مارا ہو۔ ہتھوڑے کی ضرب میں قریب تر ہوئی جا رہی تھیں۔ ایلی دیوار میں مندے کر کھڑا ہو گیا۔ چھپانے کے لئے اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ مہندی کی بوكا ریلا آیا۔ ترپ کروہ نالی میں گر پڑا جیسے ناگ نے ڈوس لیا ہو۔ بے بسی میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

نہ جانے کتنا عرصہ ایلی نے اپنا بایاں ہاتھ بغل میں چھپائے رکھا۔ وہ ایک ہاتھ سے روٹی کھاتا تھا۔ ایک ہاتھ سے منہ ڈھونتا اور سارے کام اسی ایک ہاتھ سے کرتا تھا۔ جب کبھی مجبوری کی وجہ سے مہندی رنگا ہاتھ بغل سے نکالتا تو اسے محسوس ہوتا جیسے ابا نے کپڑے اتر وا کر اسے گلی میں نکال رکھا ہو۔ جہاں وہ نالی میں منہ دے کر رورہا ہو۔

انوکھا باب

اس زمانے میں وہ رہنگ میں رہتے تھے جہاں اس کے ابا ملازم تھے۔ روہنگ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ گلیاں ویران تھیں۔ دکانوں میں سرخ گوشت کے بڑے بڑے

مکلوے لکھے رہتے تھے اور مضبوط بانہوں والے پست قد قصائی کلہاڑیوں سے ان مکلوں کو کاشنے میں مصروف رہتے۔ موٹی موٹی عورتیں یوں کچر کچر باقی کرتیں جیسے چارہ کاشنے کی مشینیں چل رہی ہوں۔ پھر علیٰ احمد سیر کیلئے دلی گئے تو ایلی کو بھی ساتھ لے گئے۔ دلی کو دیکھ کر ایلی ونگ رہ گیا۔ اتنا بڑا شہر دیکھنے کا اسے پہلے کبھی اتفاق نہ ہوا تھا بازاروں کی بھیڑ، دو کالون کی قطاریں۔ خواص پچے والوں کا شور اور تنگوں اور گاڑیوں کا تسلسل دیکھ کر اس کے دل میں نئی بیداریوں نے کروٹ لی۔ دلی میں ماموں حشمت علی کا کھجور جہاں وہ بھرے تھے بذاتِ خود ایلی کے لئے اچنچھے کی چیز تھی۔ وہاں کی ہر بات زرالي تھی۔ ہر طریقہ انوکھا تھا۔ اس سے پہلے کسی کے گھر رہنے کا ایلی کو اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس نے اپنے کھڑکے علاوہ وہ کسی گھر یا ماحول سے پورے طور پر واقف نہ تھا۔ حشمت علی ابا ہونے کے باوجود ہمیشہ سر جھکا کر چلتے تھے۔ دفتر سے واپسی پر علیحدہ کمرے میں ٹین کے سپاہی کا کھیل کی بجائے اپنے بچوں کے درمیان بیٹھ جاتے۔ ایلی کے لئے یا ایک اچنچھے کی بات تھی۔ اچھا باب پ تھا وہ باب نہ ہوا ساتھی ہو گیا۔ ایلی سمجھتا تھا کہ باب وہ ہوتا ہے جو بچوں کے لئے ہمیشہ دور رہے۔ جس کی تیوری چھپھی رہے۔ جس کے انداز میں ایک شان برتری ہو بے نیزی ہو۔ جو دو انگلیوں میں گوشت کا مکلا اٹھا کر بیٹھے کو آواز دے۔ ”ایلی“

حشمت علی کے چھوٹے بیٹے جمیل کو دیکھ کر ایلی کو اس کی جرأت پر حیرانی ہوتی تھی۔ باب سے ذرا بھی ندرتا تھا۔ بات بات پر ماں سے لپٹ جاتا تھا۔ اس کے با وجود اس کے ابا اس کے کپڑے اتروا کر اسے گلی میں نہیں نکالتے تھے۔ جمیل کتنا ڈر اور آزاد تھا۔ وہ دلی کے بازاروں میں اکیلا گھومتا پھرتا تھا۔ بجوم کو چیرتا ہوا نکل جاتا۔ ”چلو ایلی“، جمیل نے اسے کہا۔ ”چلو ہم تمہیں سوہن حلوا کھائیں گے۔ یہ دیکھو۔“ اس نے مٹھی کھوی۔ ”یہ دیکھو۔ اٹھنی.....“ ایلی حیران رہ گیا۔ اٹھنی کا حلوہ! اٹھنی ایلی کے نزدیک بہت بڑی رقم کا حلو؟ لیکن جمیل کو اٹھنی مل کیسے گئی۔ ”آؤ

”جمیل نے کہا ”هم تم کو دکھائیں۔ اٹھنی کا حلوہ لیں گے۔ پھر بھی یہ ہماری ہی رہے گی۔“ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اٹھنی کا حلوہ خریدو۔ اٹھنی پھر بھی ہاتھ سے نہ جائے۔ ضرور جمیل مذاق کر رہا ہے۔ ایلی چپ چاپ جمیل کے ساتھ ہولیا ”سنواٹھنی بچانے کا طریقہ یہ ہے کہ ایسی دوکان پر چلو جہاں بھیڑ لگی ہو۔ باں بھیڑ میں سودا خوب رہتا ہے۔“ جمیل اسے سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا اور ایلی جیمان ہو رہا تھا۔ ایسی باتیں اسے بھی نہ سمجھی تھیں۔

جمیل سے مل کر اسے کئی ایک باتوں کا پتہ چلا۔ عجیب و غریب باتوں کا مثالاً یہ کہ اس کے بڑے بھائی صدر کو تھیڑ کی ایک پارسی لڑکی سے عشق تھا۔ پارسی لڑکی۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ تھیڑ میں جا مردی کے لئے کہ پارسی لڑکی کیسی ہوتی ہے اور اس سے عشق کیسے لگتا ہے، لیکن جلد ہی وہ ہمایوں کے مقبرے اور قطب صاحب کی لاث پر جا پہنچے اور وہ ان عالیشان عمارتوں میں کھو گیا۔ پھر رہنگ میں واپس آنے کے بعد اسے پارسی لڑکی کا خیال آیا اور وہ چوری چوری خواہش کرنے لگا کہ کبھی وہ بھی پارسی لڑکی کو دیکھے لیکن رہنگ میں تو ہر طرف پوری عورتیں تھیں جو پتھر کو نہ میں گلی رہتی تھیں اور یا موٹی عورتیں جو کچھر کچھر باقی کرتی رہیں۔

اجمل کے بال

پھر رہنگ میں اس کا پھوپھی زاد بھائی اجمل آگیا۔ اجمل کا قد لمبارگ نگھر اور جسم بھرا ہوا تھا۔ اس کے بال کس قدر مامن اور لمبے تھے۔ کپڑے بھی تو بہت خوبصورت پہنتا تھا۔ ایلی اجمل کو غور سے دیکھتا رہتا تھا کہ اسے پارسی لڑکی بھی بھول گئی۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ بھی اجمل کی طرح اوپنجا مبارگا ہو جائے۔ اس کا جسم بھی اسی طرح نگھر جائے اور بال اجمل کے بال تو ایلی کی نظر میں بے حد خوبصورت تھے۔ وہ اجمل کو چلتے پھرتے اٹھتے بیٹھتے غور سے دیکھتا اور اجمل ساختے کی کوشش کرتا۔ اس کا بھی چاہتا تھا کہ اجمل اسے دوست سمجھے جیسے دل میں جمیل اسے دوست

سمجھتا تھا اور وہ دونوں رہنگ کے بازار میں اکٹھے سو، ہن طوہ خریدنے جائیں، لیکن اجمل نے کبھی ایلی کو اہمیت نہ دی تھی۔ سکول میں وہ بڑیلوگوں کے ساتھ رہا کرتا تھا اور بیچارے ایلی کو اس کے پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا۔ نہ جانے وہ بڑے لڑکوں سے مل کر کیا کیا باتیں کیا کرتا تھا۔ جب ایلی ان کی باتیں سننے کے لئے قریب جاتا تو وہ باتیں کرنا بند کر دیتے یا سرگوشیاں کرنے لگتے۔ بڑی مشکل ہی بورڈنگ کے لڑکے اجمل کی دعوییں کیا کرتے تھے۔ کھانے کے بعد وہ گھنٹوں بیٹھ کر پیس ہانکا کرتے۔ گھر میں اجمل کا رو یہ عجیب ہمارا تھا۔ جیسے گھر والوں سے کوئی تعلق ہی نہ ہوا اور صفیہ، صفیہ تو اس کے لذت دیکھ اس مکان میں رہتی ہی نہ تھی۔ چاہے وہ مہندی رنگے ہاتھ چلاتی یا اپنی انگوٹھیاں ہٹاتی اجمل کو سمجھ جبر ہی نہ ہوتی وہ بال بنا کر چکے سے باہر نکل جاتا پھر صفیہ غصہ میں چلاتی: ”باجرہ یہ کیا ہے۔“ تمہیں برتن صاف کرنے بھی نہیں آتے اور یہ دیکھو شاغم تو تم نے بالکل ہی جلا دیتے ہیں۔ ”پھر وہ نیا جوڑا پہنچتی خوبصورتی اور علی احمد کا انتظار میں بیٹھ جاتی۔ علی احمد کے آنے پر ٹین کا سپاہی میدان عمل میں نہ آتا بلکہ اس کی جگہ کٹ پتیوں کا کھیل شروع ہو جاتا۔ ایک ملتیں کرتی دوسرا منہ چڑھاتیا یک سیٹیاں بجا کر بر ماتی دوسرا ناک چڑھاتی۔ ایک ہنسی ہنسے جاتی، دوسرا گھورتی اور پھر جب دروازہ کھلتا تو شامکوٹ کا قلعہ یوں ٹھمطراق سے قائم ہوتا۔ جیسے وہ ناقابل تغیر ہو۔ پھر صح اٹھتے ہی علی احمد چلاتے ”اجمل ادھر آؤ یہ کیا واہیلت عادت ہے تم سارا دن بنے سنبور نے میں گزار دیتے ہو اور شام مغلون میں بسر کرتے ہو اور تمہارے یہ بال کتنے واہیات بال ہیں جیسے عورتوں کے ہوتے ہیں۔ بہت جاؤ میری نظر سے دور ہو جاؤ۔“

پھر ایک رات کٹ پتیوں کا تماشہ شدت اختیار کر گیا۔ شام کوٹ کے قلعے سے طبل جنگ بجھنے لگا اور ٹین کے سپاہی نے گھبرا کر تھارڈال دیتے اور بند کمرے پر موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔ اگلی صح جو نبی علی احمد بیدار ہوئے تو گھر پر ایک

مصیبت لوٹ پڑی۔ ”یہ چیز یہاں کیوں رکھی ہے؟ وہ وہاں کیوں ہے؟“ ایلی جیران تھا کہ اس بند کرے کے سپاہی کو کیا ہوا کہ اپنی سرز میں چھوڑ کر گھر کے ویرانے میں گھومنا شروع کر دیا۔ لیکن جلد حیرت مصیبت میں بدل گئی۔ جب علی احمد نے لکار کر کہا ”تم پڑھتے کیوں نہیں ہر وقت لکھتا ہے۔ لندور۔ ادھر آؤ۔“ اور آخر کار تان اجمل پڑا توئی۔ شیخہ یہ ہوا کہ جام بلوا کرا جمل اور ایلی دنوں کے بال کشادیے گئے اور علی احمد فاتحانہ قہقہہ لگا کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ ان رات ایلی رضا میں منڈھان پر کروٹار ہاکہ اباہائے اجمل بال بانے اجمل کے بال۔

اس کے بعد علی احمد نے اجمل کے باہر جانتے اور شام میں باہر بس کرنے پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ حتیٰ کہ ایک روز اجمل دیر ہے کھڑا کیا تو انہوں نے اجمل کے منہ پر تھپٹر جمادیا ”بڑا بنتا ہے تو“ اور اجمل رونے لگا۔ اندر صفیہ مسکراہی تھی۔ مسکرانے جا رہی تھی۔ وہ ہاتھ کی انگوٹھیاں گھمارہی تھیں اور رضاۓ میں منڈال کر ایلی نہ جانے کیوں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا ”میں بڑا ہوں۔ میں دسویں پاس کرلوں۔“

اگلے روز اجمل مدرسے سے واپس نہ آیا شام کے وقت ایک آدمی ایک رقمہ لایا۔ لکھا تھا، میں گھر جا رہا ہوں۔ میرا انتظار نہ کریں۔ اجمل کے جانے کے بعد ایلی اکیلا رہ گیا۔ اگر انہی دنوں ابا کا تبادلہ دورا ہے نہ ہو جاتا تو ایلی کے لئے وقت کا شنا مثل ہو جاتا۔ بہر حال وہ رہنگ چھوڑ کر دورا ہے چلے گئے۔

اس نے شہر میں ان کے مکان کے سامنے ایک گندہ نالہ بہتا تھا جس کے ارد گرد پچھلیا کرتے تھے۔ ایلی کے لئے یہ نالہ بہت بڑی نعمت تھی جہاں کھیل کر وہ ابا کی بے حصی اور صفیہ کے غایظ ہاتھوں کو بھول سکتا تھا۔

خاتم

ایک روز جب وہ گندے نالے کے قریب کھیل رہا تھا تو اس کے ابا بہر نظرے۔ ایلی انہیں دیکھ کر سہم گیا۔ علی احمد رک گئے چاروں طرف دیکھا اور پھر ایلی کو اشارہ

کر کے بلا یا۔ وہ ڈر گیا نہ جانے اب اسے کیوں بلار ہے تھے۔ اس سے پہلے تو انہوں نے اسے بیوں کبھی بلا یا نہ تھا یا تو وہ خاموشی سے پاس سے گزر جایا کرتے تھے اور یا اسے دیکھ رک کہتے ”تو یہاں کھیل رہا ہے۔“ ووڑ گھر جانا لاکٹ سارا سارا دون کھیلتا رہتا ہے۔“ اور ایلی چپکے سے ووڑ کر گھر میں جا چھپتا۔ اس روزان کے بلا نے پر ایلی ڈرتا ہوا پاس آیا۔ اس کا خیال تھا کہ پاس بلا کر ابا گھوریں گے اور اسے گھر جانے کو کہیں گے۔ لیکن ایلی قریب آیا تو وہ بولے ”ادھر۔ ہمارے ساتھ“ اسے اپنی آنکھوں اور کانوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ضرور کوئی غلطی ہو گئی ہے شاید اس نے ان کا اچارہ غلط سمجھا ہو لیکن یہ روہ چپ چاپ آگئے گے کیوں چل پڑے تھے۔ پھر اسے خیال آیا شاید وہ اسے گھر کے لئے اونی چینز خرید کر دینے کے لئے ساتھ لے جا رہے تھے۔ بہر حال ساری بات عجیب تھی۔ ایلی ان کے پیچھے خاموشی سے چلنے لگا بازار آیا اور ختم بھی ہو گیا لیکن خاموش چلتے گئے۔

بازار کے اختتام پر علی احمد ایک گلی میں گھوم گئے اور دریتک پر بیچ گلیوں میں چلتے رہے۔ حتیٰ کے گلیاں بھی ختم ہو گئیں اور روہ شہر کے باہر کالی سڑک پر جا پہنچے۔ سڑک کے دوسرے سرے پر وہ اس مختصری آبادی میں داخل ہوئے جو ریل کے پل کے پار تھی اور اس نو گلیوں میں جا گئے جہاں چھوٹ چھوٹے گھروندے بنے ہوئے تھے۔ بالآخر وہ ایک دروازے پر کے جہاں علی احمد نے دروازے پر دستک دی کچھ دیر کے بعد دروازے کی درز میں ایک موٹی سی اتنی بڑی کالی آنکھ دکھائی دی ”خانم،“ علی احمد نے آہستہ سے کہا۔ اندر سے گویا چاندی کی گھنیماں بخنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور ایک سرخ و سفید شہر طلوع ہو کر چاروں طرف چھا گیا۔

خانم کو دیکھ کر ایلی کامنہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ چوڑے گورے پٹھے چہرے پر دو موٹی موٹی کالی آنکھیں مسکارا ہی تھیں ”اوہ بیٹھو۔“ اس نے چار پاٹی کھینچ کر کہا ”بیٹھ جاؤ۔“ علی احمد نے ایلی کو حکم دیا اور وہ خود بے تکلف چار پاٹی پر لیٹ گئے ”حقہ بھر جاؤ۔“

نذر خاتم، علی احمد نے یوں کہا جیسے وہ ان کا اپنا گھر ہو۔ خاتم نے جلدی سے چلم میں دو کو لے ڈالے اور پھر علی احمد کے پاس بیٹھ کر اس سے بے تکلف باتیں کرنے لگی۔ جلد ہی وہ دونوں ایلی کے وجود سے بے خبر ہو کر ایک دوسرے میں کھو گئے۔ ایلی حیران تھا کہ خاتم کون ہے اور اس کا منہ اتنا چوڑا اور سرخ و سفید کیوں ہے اور اس کی آنکھیں اتنی شوخ کیوں ہیں اور رعب بھرے چہرے کے باوجود اس قدر مسکراتی کیوں ہے اور اس کی طرف دیکھنے کو جی کیوں چاہتا ہے۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھا کہ ابا وہاں یوں لیٹ کر حقہ پی رہے ہیں۔ جیسے وہ ان کا اپنا گھر ہو اور خاتم یوں ان کے پاس بیٹھی تھی جیسے صفیہ بھر میں ان کے پاس بیٹھا کرتی تھی۔ صفیہ اور خاتم کا کوئی مقابلہ بھی تو نہ تھا اگر چھفیہ کا لفٹ بھی کافی سفید تھا۔ اس کے چہرے سے بھی رعب برستا تھا۔ لیکن صفیہ کے ماتھے پر تو ہر وقت شکن پڑی رہتی تھی۔ اس کے بر عکس خاتم مسکرانے جا رہی تھی۔ وہ ایلی کو دیکھ کر ویسے ہی مسکراتی تھی۔ جیسے علی احمد کو دیکھ کر جیسے ان دونوں میں کوئی فرق نہ ہو۔ صفیہ تو صرف علی احمد کی طرف دیکھ کر مسکرا یا کرتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خاتم کے ہاتھ مہندی رنگے نہ تھے۔ کتنے صاف سترے ہاتھ تھے اور انگلیوں میں انگلوٹھیاں بھی تو نہ تھیں۔

وہ باتیں کرنے میں مشغول تھے کہ اندر کوئی بچہ رونے لگا۔ بچے کے رونے کی آواز سن کر ایلی گھبرا گیا نہ جانے کہاں سے ایک شخص میلی سی چادر میں لپٹا ہوا آموجوہ ہوا ”دیکھ تو سراب رو رہا ہے۔“ خاتم بولی اور پھر علی احمد سے باتوں میں مشغول ہو گئی اور وہ چادر میں لپٹا ہوا عورت نما شخص اندر جا کر بچے کو تھکنے لگا۔ نہ جانے وہ شخص کون تھا۔ تو کروٹ نہیں معلوم ہوتا تھا وہ..... خاتم کا خاوند بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر کون تھا۔ ایلی کے لئے وہ مکان ایک رسموس ہونے لگا وہ بے تکلف مسکرانے والی عورت۔ وہ عورت نامار دا اور وہ تو نتا بچہ۔

”اچھا تو یہ لڑکا ہے۔“ خاتم نے اپنے ہاتھ سے ایلی کے منہ کو تھکنے ہوئے کہا۔ اس

کی اس تھپک میں کتنا پیار تھا۔ ایلی کے جسم میں ایک جھر جھری سی ناچنے لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ خانم کا ہاتھ اس تھپکتا رہے اور وہ بڑی بڑی کالی آنکھیں ویسے ہی مسکاتی رہیں اور اس کے سامنے وہ بڑا سامنخ و پیدر چہرہ یونہی معلق رہے اور وہ ابا کے ساتھ ہمیشہ وہیں اس مٹی کے گھروندنے میں رہے اور اور.....

اس کے بعد گندے نالے کے پاس کھیلتے ہوئے وہ چوری چوری دعا میں مانگتا کہ ابا گھر سے انکل کراؤ سے اشارہ کریں۔ ایلی ادھر آؤ ہمارے ساتھ چلو وہ سای طرح خانم کے گھر جائے اور اس دروازے سے خانم کی سیاہ آنکھیں دیکھئے اور بالآخر اس کا ہاتھ سے تھپک۔ بھی بھی اس کی خواہش پوری ہو جاتی۔ ابا باہر انکل کر انگلی کے اشارے سے بلاتے اور پھر کہتے ”اُس مکان میں جہاں تم اس روز گئے تھے تمہیں یاد ہے ناہاں جاؤ اور خانم کو یہ دے آؤ۔“ اور وہ تھپک سے ایک گٹھڑی سی اس کی بغل میں تھما دیتے۔ ”کسی سے کہنا نہیں سمجھے۔“ وہ زیر لب کہتے اور ایلی خانم کے گھر کی طرف اڑ لیتا اور پھر خانم کا چٹا سفید ہاتھ پیار سے اس کے منہ کو تھپکتا اور اس کے ہونٹ سہلاتا وہ مٹی کا گھروند اس کی آنکھوں تلے کاغذتا اور اس کے دل میں کچھ کچھ ہو تانہ جانے کیا ہوتا۔

پھر ایک روز خانم ان کے اپنے گھر آگئی۔ ایلی نے اسے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ خانم نے رازدارانہ نگاہ ایلی پر ڈالی۔ اندر سے ابا بھاگے باہر آئے۔ ”صفیہ یہ استانی ہیں۔ اسلامیہ سکول کی بڑی استانی تم سے ملنے آئی ہیں۔ بیٹھ جاؤ۔ استانی صاحب۔“ ایلی ان کے لئے کچھ لاونا بھی۔ اتنی دور سے آئی ہیں۔ لکنی دور ہے آپ کا سکول، ہاں آٹھ کوں مجھے یاد آگیا اور نام کیا ہے۔ سلاں والی نہیں نہیں۔ سیل آباد ٹھیک،“ اور علی احمد کو دیکھ کر خانم نے اتنا بڑا گھونگٹ نکال لیا اور ان کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گئی۔ پھر وہ ایلی کی طرف دیکھ کر رازدارانہ انداز سے مسکرانے لگی۔ لیکن وہ ابا سے پر دہ کیوں کر رہی تھی؟ اس نے گھونگٹ کیوں نکال رکھا تھا کیا وہ استانی تھی؟ لیکن وہ تو

وہیں رہتی تھی۔۔۔ شہر میں پھر ابا کیوں کہہ رہے تھے کہ وہ سیل آباد سے آئی ہے ایلی سمجھ میں خاکب بھی نہ آیا۔۔۔ مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ خانم عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔۔۔ جیسے اسے بارہی ہو جیسے ہاتھ کی بجائے نگاہوں سے اسے تھپک رہی ہو۔۔۔ سہلا رہی ہو۔۔۔

”غیریں غیریں۔۔۔ علی احمد کہہ رہے تھے ”اگر آپ کو میرا یہاں آنا ناگوار ہے تو میں باہر چلا جاتا ہوں۔۔۔ ہاں ہاں اچھا تو آپ کے سکول میں لتنی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں؟ آپ کے سکول کا بچہ چھپا ہے۔۔۔ خانم مسکرائے جا رہی تھی۔۔۔ مسکرائے جا رہی تھی۔۔۔ صفیہ گلوخور اور اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور باہر جرہ اندر بینر رنگ کی میٹھی بولتیں کھولنے میں مصروف تھیں تاکہ سیل آباد کی استانی کی واضح کی جاسکے۔۔۔

تمین پچ

اس روز ایلی کو ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔۔۔ جیسے وہ تمین پچے عجیب و غریب کھیل کھیل رہے ہوں۔۔۔ علی احمد، خانم اور ایلی۔۔۔ ابا تو یوں سنجیدگی سے باتیں کئے جا رہے تھے۔۔۔ جیسے وہ علی احمد نہ ہوں۔۔۔ مگر ان کی آنکھوں کی چمک ان کے بہروپ کی چغلی کھا رہی تھی اور خانم یوں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی؛ جیسے واقعی ہی علی احمد اس کے لئے ایک بیگانہ شخص ہوں۔۔۔ لیکن وہ ہر بار ایلی کی طرف دیکھ کر یوں آنکھ چکاتی کہ اسے اس انوکھے کھیل کا لطف آ جاتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ کھیل ہمیشہ کے لئے جاری رہے۔۔۔ اور خانم اس کی طرف دیکھ مسکاتی رہے ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ قہقہہ مار کر نہ دے۔۔۔

پھر جلد ہی چند ایک ماہ کے اندر اس استانی کا راز محل گیا جو سیل آباد کے سکول میں پڑھاتی تھی اور علی احمد سے گھونگٹ نکالنے میں احتیاط سے کام لیتی تھی اور صفیہ کامنہ غصے سے لال ہو گیا اور اس کی آواز سارے محلے میں گوئختے گئی۔۔۔ حالات بگڑتے دیکھ کر علی احمد تو گھر سے باہر چلے گئے اور جان بو جھ کر دیرے سے آئے۔۔۔ حقیقت یہ تھی کہ

روز بروز علی احمد کی طبیعت صفیہ سے ہٹتی جا رہی تھی اور سفیہ کو خود اس کا احساس ہوتا جا رہا تھا کہ اس کا اثر ختم ہو چکا ہے۔ اپنے اثر کو قائم رکھنے کے لئے اس نے از سنرو ہائیوں پر مہندی لگائی۔ باریک ریشمیں قمیص پہنی سیاہ کناری والے دوپٹے اور ٹھیک کرنے کے لیکن ان کوششوں کے باوجود اس کا رنگ زرد پڑتا گیا اس کی آواز مر جھائی۔ یہ محسوس کر کے صفیہ نے نئے پہلو سے اپنی اہمیت کا احساس اخذ کرنے کی کوششیں کیں۔ علی احمد نہیں تو نہ ہی ہاجرہ جو ہے جس پر حکومت کر سکتی تھی۔

علی احمد مزاج کے بہت شافتہ واقع ہوئے تھے۔ وہ صفیہ کے غصے کو دیکھ کر چور چوری مسکراتے اور پھر شجیدگی سے ان گلرے ہوئے حالا پر بات کرنے کی بجائے جھٹ ٹین کا سپاہی نہیں جاتا اسے جاتا جنمی کہ صفیہ کا غصہ ختم ہو جاتا اور وہ مسکرانے لگتی اور ٹین کا سپاہی فاتحانہ طور پر قیقہ لکاتا اور سب ٹھیک ہو جاتا۔ لیکن اس کے باوجود اب سب ٹھیک نہ ہوتا تھا۔ صفیہ کے دل کی پھانسی نکلتی تھی اور اس کا رنگ روز روز زرد ہوتا جا رہا تھا۔ خانم روز آموجو ہوتی تھی اس کی موجودگی سے صفیہ کا رنگ اور بھی پھیکا پڑ جاتا اور گھر میں خانم کے قیقہ گو نجتے اور اس کی کالی آنکھیں مسکاتیں اور علی احمد دبی دبی خوشی سے بے تاب ہو کر جھومنتے اور چلاتے ”ایلی اب تم ذرا سراب کو کھلاو بآہر جا کر کھلاو اسے۔ اسے باجا سناو۔“ اور ایلی بڑی مسرت سے سراب کو اٹھا لیتا اور خانم کے چھپیر دینے والے ہاتھ ایلی کے منہ کو تھکتے اور اس کا جسم جھن جھنے کی طرح بجتا اور رگ و پے پر پیر بہو ٹیاں اسی چلتیں اور خوشی سے اس کے پاؤں زمین پر نہ نکلتے اور وہ محسوس کرتا جیسے ہوا میں اڑا جا رہا ہو۔ خانم کی نگاہیں علی احمد کو جھنجھننا تیں اور علی احمد فرط اس سے یانہ جانے کیوں صحن میں ادھر ادھر گھونٹے لگتے اور صفیہ بیز اڑ کر پلنگ پر جانٹھتی اور منہ دیوار کی طرف موڑ لیتی۔

خانم کے آنے سے صفیہ ایلی سے اور بھی چڑنے لگی ”ہوں تو تو ابا کے پیغام لے کر جاتا ہے شرم نہیں آتی۔“ اور شرم آنے کی بجائے ایلی ایڑیاں اوپنجی ہو جاتیں اور اس

کی چھاتی تن جاتی اور وہ اب سے گھرے تعلقات رکھنے کے خیال سے فخر محسوس کرتا۔ ابا اب تقریباً روز کھانا کھاتے ہوئے اسے آواز دیتے ”ایلی“ اور پھر دو انگلیوں میں لٹکتا ہو گوشت کا مکلا اس کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ اب وہ اسے مرے ہوئے چوہ ہے کی طرح نہ پکڑتا تھا بلکہ یوں لٹکانے پڑا جاتا جیسے وہ کوئی تمغہ ہو اور پھر روٹی پر رکھ کر اسے یوں کھاتا کہ فرحت دیکھ لے تو جل کر راکھ ہو جائے۔

صفیہ اب عام طور پر چپ چاپ ایلی پر بی بی سہنہ اور تناہی میں کھانستی رہتی تھی۔ ادھر علی احمد کے گھرے میں خاتم کے قبیلے کو بخجتے۔ سراب کو بہلانے کے لئے ایلی گراموفون پر پرانے ریکارڈ لگاتا اور خاتم کی سریلی آواز کے ساتھ ساتھ موسيقی کا ساز چھڑ جاتا۔ ادھر باور پی خانے میں باجرہ خاتم کے لئے چائے بنانے میں مصروف رہتی۔ پھر دھنٹا علی احمد چلاتے ”ایلی سراب کو باہر لے جاؤ۔ وہاں بہل جائے گا۔“ سراب کو اٹھا کر ایلی باہر نکل آتا اندھر خاتم کی سریلی سروں پر ٹین کا سپاہی رزمیہ انداز سے رقص کرتا اور ایلی کا جی چاہتا کہ وہ چھپ چھپ کر اس رقص کو دیکھے۔

بیچاری صفیہ کا بیشتر وقت اب تھائی میں گزرتا تھا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے خاموشی سے اکتا کریا تو وہ باجرہ کو کوستی رہتی یا کھانستی رہتی۔

باجرہ نے کئی ایک بار ایلی کو بتایا تھا کہ صفیہ بیمار ہے اسے سل کا عارضہ ہو گیا ہے مگر ایلی کو اعتبار نہ آتا تھا۔ صفیہ بیماری یا کسی اور وجہ سے عاجز آجائے ایلی اس کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ صفیہ کو کوئی عارضہ ہو جائے۔ اور انہوں یہ تو محض تھائی کی وجہ سے تھا اب اجو باہر رہتے تھے اور پھر خاتم جو آجاتی تھی وہاں خاتم آتی تو گھر میں ایک شور بیج جاتا۔ خاتم کتنا شور چاہتی تھی۔ اس کا ایلی کو مسکا کر دیکھنا لگا سے ایلی کامنہ سہلانا اور اس کے منہ کو، جھن جھنے کی طرح بجانا۔ اب ایلی کو معلوم ہو چکا تھا کہ خاتم استانی نہ تھی یہ جان کر اسے بہت دکھ ہوا تھا اگر وہ استانی ہوتی تو خوب رہتا۔ وہ دل میں سوچتا تھا نہ جانے استانی کیسی ہوتی ہوگی وہ تو فرفز

انگریزی بولتی ہو گی اور پھر اونچی ایڑی کی جوتی پہن کر شپ چلتی ہو گی بالکل جیسے بازاروں میں چلتی ہیں۔

۱۰

”سلام و علیکم، عورت کی آواز سن کرایلی چوناکا۔ اس نے مرد کو دیکھا پہچے لٹکے ہوئے پردے سے ایک حنائی ہاتھ نکل آیا۔“ پہچے کو اندر بھیج دیجئے۔ کہیے اپنے تو ہیں آپ

شکر ہے ”ایلی“، علی احمد بولے۔ اندر جاؤ استانی جی بلارہی ہیں تمہیں۔ ”ایلی ہچکھاتا رہا لیکن علی احمد کی نگاہ میں سنجیدگی کی جھلک تھی“ آونہ پیٹا، اندر سے آواز آئی اور ایلی جھجکتا ہچکتا تا ہوا اندر چلا گیا۔ ارے استانی کی طرف دیکھ کروہ بھونچ کارہ گیا۔ اس کارنگ کا لاتھا جسم بھدا اور منہ پر بیز ارجھائی ہوئی تھی۔

ایلی کے تھیل میں تو استانی نہ جانے کیا تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ استانی خانم سے کہیں زیادہ خوبصورت اور نگین ہوگی اس کی آنکھوں میں شرارت چیک رہی ہوگی اور مرد گاں اشاروں سے لدھی ہوں گی اور اس کے ہاتھ خانم کے ہاتھوں سے زیادہ بے تکلف ہوں گے جو اسے جنجنہاً میں گے۔ اس استانی کے چہر پر تو خوست چھائی ہوئی تھی۔ اس کی حرکات بے حد بحمدی تھیں اور پکھر شوار کی جگہ چادر باندھ رکھی تھی۔ خورت اور چادر۔ لا حول ولا قوۃ۔ ایلی نے دل میں نفرت کھولنے لگی۔ یہ کیسی استانی کے ہاں لے آئے تھے۔ ابا شاید وہ غلطی سے وہاں آگئے ہوں۔ لیکن اس معاملے میں ابا غلطی نہیں کر سکتے تھے اور اب بھی وہ چارپائی پر مطمئن اور متوقع اندام سے لیئے ہوئے تھے۔ ایلی حیران تھا۔

استانی کی نگاہیں علی احمد پر لگی ہوئی تھیں۔ جیسے انہیں جانچ ریے ہوں توں رہی ہوں تو یہ تھیں استانی، ہمید معلمہ ”یہ لومٹھائی۔“ اس نے ایلی کے سامنے مٹھائی تھالی رکھ دی اور خدپھر سے پردے کے پیچھے آ کھڑی ہوئی وہ پھر سے علی احمد سے باقیں کرنے لگی ”شیم تو ان دونوں کشمیر میں ہے وہ وہیں رہتے ہے کیوں نہ رہے لڑکی کے کھانے پینے کے دون ہیں اور پھر وہ تو کشمیر کے میوؤں پر پلی ہوئی ہے۔ یہ سرخ چہرہ اللہ جھوٹ نہ بلائے کوئی جوانی آئی ہے لڑکی پر!“ انہیں پکھتی ہیں دیکھ کر اور پھر اوپر سے دویں پاس۔“

”اچھا دویں بھی کر لی ہے؟“ علی احمد نے قہقہہ مار کر پوچھا۔
”پچھلے سال جو کی تھی میں نے بتایا تو تھا۔“

”اچھا،“ علی احمد بولے ”لیکن تم بھی تو آج تک باقیں ہیکرتی رہی ہو بھی ملیا تو نہیں شیم سے۔“

”ہے بھی ہے بھی۔“ استانی فرانک کر جواب دیا ”صمرہ کیا ہے اس کی افروں کے سامنے کہاں آتی ہے؟“

”بیگماں اور دیکھو،“ علی احمد بولے ”ہم کیا غیر ہیں؟“

”نہیں غیر تو نہیں۔“ وہ پولی پھر بھی جب تک بات طے نہ ہو جائے ”بھی واہ۔“ وہ ہٹنے لگے ”کیا کوئی کسریاتی ہے۔ بات طے ہی آجھو۔“ نہ جانتے وہ کس کی باقیں کر رہے تھے۔ شیم کو ان تھیں وہ شیم میں کیوں پل رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر آنکھیں پھٹتی تھیں اور وہ بات کیا تھی جسے طے سمجھا جا رہا تھا۔ ایلی ان کی باتوں سے آتا گیا اور مٹھائی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ استانی سے تو مشاہی کہیں اچھی تھی۔

دُورے سے واپسی پر علی احمد نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے کہا ”دیکھو میں گھر میں کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے باپ کی طرف دیکھا اور بات سمجھے بغیر اسی اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ سوچتا رہا کہ نہ کرنے کی بات ہی کوئی تھی۔ کوئی بھی تو نہیں وہ تو وہاں دو دھن پینے کے علاوہ مٹھائی کھاتا رہا تھا اور وہ شیم کی باقیں کرتے رہے تھے اور پرده ہوا سے اڑتا رہا تھا ”ہائیں!“ دھن اسے خیال آیا۔ استانی نے تو شلوار کی جگہ چادر باندھی ہوئی تھی۔ جیسے جاث باندھتے ہیں رنگدار چادر سارا ہی نہیں، رنگ دار چادر اور قمیض، آخر استانی نے چادر کیوں باندھی ہوئی تھی۔ شاید ابا کا بات نہ کرنے سے یہی مطلب ہو گا کہ گھر والوں کو پتہ نہ چلے کہ استانی اس شلوار پہننے کی بجائے چادر باندھتی ہیں۔ لیکن وہ شیم کوں تھی۔ جو کشمیر کے چلاوں پر پل رہی تھی اور جس پر جوانی ثوٹ کر آ رہی تھی۔ شاید علی احمد شیم کی بات کو چھپانا چاہتے تھے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ بہر حال اس پر استانی کی حقیقت تو کھل چکی تھی۔ استانی سے ما یوس ہو کروہ ایک دفعہ پھر خانم کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن جلد ہی

خانم کا قرب بھی اس سے چھین لیا گیا اور علی احمد نے کسی وجہ سے انہیں علی پور بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ہاجرہ فرحت اور رایلی عیل پور آگئے۔

چوگان اور بیڑے

پہلی مرتبہ محلہ میں آکر اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ محلے والے اسے علی احمد کا وارث سمجھتے ہیں اور اس لگی ماں کو گھر کا نو کرنیں سمجھتے اور پلنگ پر بیٹھنے والی صفیہ کو گھر کی مالکہ نہیں مانتے ”تم آگئے بیٹا۔“ چھی جان نے اسے دیکھ کر پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا ”اچھا ہوا تم یہ گھر تھہاراہی ہے۔ جو تم ہو وہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اور وہ صفیہ کا لے منہ والی چیز میں اسے کوئی جانتا ہے اچھا گھیو بیٹا کھیلو،“ بوڑھی جاناں چلائی ”خدا کا شکر ہے یہ میرا بیٹا ایلیں کھر آیا۔ جانے دو علی احمد کو در در کی خاک چھانتے تم کیا اس کے نو گھر ہو جو اس کی چاکری کرتے پھرتے ہو۔ تم اللہ کے فضل سے اس گھر کا چاند ہو۔“

”آگئی تو ہاجرہ۔“ برکتے بولی۔ ”سو بار آؤ تھہارا اپنا گھر ہے بیٹی۔ علی احمد کا کیا ہے اس کے سر پر تو عمورتوں کا بھوت سوار ہے۔ بس محورتیں ہوں۔ اللہ ماری رنگ رنگیں۔ ان کے نخزے ہیں اور پھیٹر چھاڑ ہو اور میاں پر یوں کے درمیان میں اندر بن کے بیٹھے رہیں دفع کر علی احمد کو۔“ ہاجرہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ ”ند بیٹی تو اپنا آپ کیوں ہلکاں کرتی ہے۔ تیری بلا سے جتو ہے وہ اور کون ہو سکتی ہے۔ محلہ والوں کی نگاہ میں۔ آپ جھک ماما کر تھک جائے گا۔ اللہ کرے یہ تیرا ایلی جیسے زندگی ورزنا ہو۔“

کئی ایک روز تو محلہ والیوں کا تاثنا بندھا جا رہا اور ہاجرہ بات بات پر آنسو بھاتی رہی اور محلے والیا اسے دلا سے دیتی رہیں ایلی جیران تھا کہ اماں بات بات ہر رو کیوں دیتی ہے۔ رونے کی تو کوئی بات نہ تھی نہ جانے پھر وہ کیوں روئے جا رہی تھی۔ شاید اس لئے کروہ صفیہ سے جدا ہو گئی تھی۔ مگر محلے میں پہنچ کر تو اس کا انداز ہی بدلتا گیا۔

تھا۔ جیسے وہ صفیہ سے بیز ار ہو۔ جیسے وہ خوشی سے اس کے خدمت نہ کرتی ہو مگر باہر کر تو وہ صفیہ صفیہ کرتے تھکتی نہ تھی۔ ایلی کو کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

نیچے احاطے میں محلے کی بوڑھیاں چرخ رکھے باتوں میں مشغول تھیں۔ سب انہیں کی باتیں کر رہی تھیں۔ علی احمد کے قصہ۔ ہاجرہ کی مظلومیت۔ چاروں طرف لوگ ہاجرہ فرحت اور ایلی سے ہمدردی جتار ہے تھے اور ہاجرہ کی نیکی اور خدمت گزاری کا تذکرہ کرو رہے تھے اور ہاجرہ ڈھلنے آنسوؤں کے باوجود پھولے نہ سام رہی تھی۔ آنسوؤں کے علاوہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ ایلی نے اس چمک کو پہلے سمجھی اس کی آنکھوں میں نہ دیکھا تھا۔

گھر میں سرف دادی اماں خاموش تھیں وہ ایلی کی طرف دیکھتی مسکراتی اور پھر تونخ انداز سے کہتی ”ایلی اب تو سارا دن آوارہ گردی ہی کرتا رہے گا کیا۔“ اور ایلی محسوس ہوتا جیسے وہ اسے گھونٹنے کی بجائے پیار کر رہی ہو۔ ”اسدھر آ۔“ وہ چلاتی اور ایلی دیکھنے کی بجائے اس کے کندھوں پر جا سوار ہوتا اور پھر بڑھیا نہستی۔ ”تو تو میرے کندھے توڑ دے گا۔“ ہٹ اب مجھے نماز پڑھنی ہے۔ دفع ہو۔“ اور ایلی کے کندھوں سے اور بھی چمٹ جاتا۔

ہاجرہ کو رو تے دیکھ کر دادی اماں ہاتھ چلا کر کہتی ”تو تو پاگل ہے لڑکی خواہ مخواہ جان کھپا رہی ہے۔ علی احمد کا کیا ہے۔ ہو جائے گا ٹھیک آپ ہی مردا یے یہ ہوتے ہیں۔“

کئی ایک دن تو یونہی رونے دھونے کا سلسلہ جاری رہا پھر ایلی اکتا کر باہر نکل گیا اور چوگان میں کھیلنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ محلے کے لڑکوں سے واقف ہوتا گیا اور دیہرے دیہرے اس کی جھجک کم ہوتی گئی۔ جمیل سے مل کر وہ بے حد خوش ہوا اسے دلی کی یاد آگئی جہاں وہ پارسی لڑکی رہتی تھی اور اٹھنی دیئے بغیر انہوں نے حلوہ خریدا تھا۔ جمیل نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”آؤ ایلی چلو پیڑے کھائیں۔“ ”پیڑے“ ایلی کے منہ

میں پانی بھر آیا۔ ”لیکن کیسے۔ تمہارے پاس اٹھنی ہے کیا؟“ ”نہیں،“ جمیل بولا۔ ”روپے بہت سے روپے آؤ دکھاؤں تمہیں۔“ جمیل نے لکڑی کی چوکی اٹھائی اور اس کے پاؤں تلے دور روپے پڑے تھے۔ ایلی حیران رہ گیا ان کے گھر میں تو ایسی کوئی چوکی نہیں تھی؛ جس کے پاؤں تلے روپے ملتے ہوں چوکی تلے روپے اس نے حیرانی سے جمیل کی طرف دیکھا۔ ”ہاں،“ جمیل نے لاپرواں سے کہا۔

”اماں کے ہیں۔ میں نے اخاکر چوکی تلے چھپا دیئے تھے۔“
اتھ پیرے ایلی نے بھی زندگی بھرنے دیکھے تھے۔ اس نے چار ایک تو بڑے شوق سے کھائے۔ ابھر وہ اکتا گیا اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس نے گناہ کیا ہے جرم کیا ہے۔ اتنے پیرے خدا یہ نہ جانتا جرم نہیں تو اور کیا ہے۔ اس نے شدت سے محسوس کیا کہ چاندِ حلوائی کو معلوم تھا کہ وہ روپے اس نے چوکی تلے سے نکالے ہیں۔ وہ مسکرا رہا تھا۔ خاموش مگر چالاک مسکراہٹ اور جھینپ رہا تھا۔
نہیں۔ نہیں۔ میں نہیں۔ میرے پاس تو ایک پیغمبر نہیں ہے۔

پیرے کھانے کے بعد ایلی پر مجرمانہ خاموشی طاری ہو گئی اور وہ واپس چلے آئے۔
ٹھک ٹھک ٹھک، ایلی نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ ہائیں وہ گھبرا گیا۔ رضا لکڑی تیکتا اور لکڑی ناگ گماتا ہوا آرہا تھا۔ اس نے انہیں لٹکا را۔ ”کہاں سے آئے ہو تم۔“ بک نہیں بے جمیل ہنسنے لگا۔ ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا ضرور اس لکڑی کو جمیل کی ماں نے بھیجا ہو گا۔ ”بے۔“ رضا چلا یا۔ اکیلے اکیلے پیرے کھاتا ہے تو اور اسے کھلاتا ہے۔ ہوں۔ یہ پیرے ایلیے ہضم نہیں ہوئے۔ بتا دوں میں۔“

جب وہ دونوں بڑی ڈیوڈھی کے پاس پہنچ تو جمیل کو دیکھ کر سب چلانے لگے
”کیوں بھئی پیرا۔“ ایلی کا رنگ فت ہو گیا اس کے منہ سے بات نہ لکھتی تھی اور وہ سب شور مچائے جا رہے تھے۔ رضا، خیاء، بالا اور پھر کان پر ہاتھ رکھ کر چلا یا۔ ”بازار بکیندی برلن۔“ آہا بھائی واہوا۔ رضا نے لکڑی ناگ کھا کر دو دینی شروع کی اور

ان سب کی توجہ پیڑوں سے ہٹ کر بالے کے گانے کی طرف مبذول ہو گئی اور ایلی چپکے سے وہاں سے سرک آیا اور دادی اماں کی رضاۓ میں چھپ کر پڑ رہا۔

چار ایک دن تو اس کے لئے گھر سے باہر نکانا مشکل ہو گیا۔ لیکن چھپے رہنا بھی تو ممکن نہ تھا۔ اس لئے اسے باہر نکانا ہی پڑا اور اسے معلوم ہوا کہ رضا، خیا، بالا اور ارجمند سمجھی جمیل ہے پیڑے کھاتے ہیں اور جمیل روز چوکی سر کا کروپے نکال لاتا ہے۔ اور وہ سب اس راز سے واقف ہیں یہ جان کر اس کے دل سے وہ بوجھا تر گیا اور ہوڑکوں میں شامل ہو گئے۔

انکرا اینڈی مایاں

پھر اسے مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ انکرا کا سکول محلے کے باقی لڑکوں کے سکول سے بہت دور تھا۔ محلے کے قریبی سکول والوں نے ایلی کو داخل کرنے سے انکار کر دیا ایک تو وہ پڑھائی میں کمزور تھا اور دوسرا سے اس مدرسے میں جگہ نہ تھی۔ لیکن داخل ہونے کے بعد اسے اطمینان سا ہو گیا کیونکہ جلد ہی اسے معلوم ہوا کہ اس اسکوم میں بھی محلے کے چند ایک لڑکے تعلیم پار ہے تھے ان لڑکوں میں ارجمند سب سے زیادہ تیز تھا۔ ارجمند ڈاکٹر ڈاکٹر کا بیٹا تھا وہ سب مل کر پانچ بھائی تھے۔ سب اوپر نچے لبے پتلے دبلے بچپن کا زیادہ تر زمانہ پانی پت میں برس کر کے وہ پہلی مرتبہ علی پور آئے تھے۔ ان کے والداب بھی پانی پت میں ڈاکٹر تھے۔ جہاں ڈپنسری میں انہوں نے اپنی عمر کا زیادہ تر حصہ سر کیا تھا۔

ارجمند بے حد لمبا تھا حالانکہ وہ ایلی کے ساتھ نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس کے قدو قامت اور بر تاؤ سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے عرصہ دراز سے فارغ التحصیل ہو چکا ہو۔ پانی پت میں رہنے کی وجہ سے ارجمند فر فر اردو بولتا تھا۔ جہاں کوئی اجنبی آیا اس نے چار ایک خوبصورت فقرے چلا دیئے۔

”آئے تشریف لائیے۔ فرمائیے۔ خاکسار کیا خدمت کر سکتا ہے۔“ اور ادھروہ

گیا ادھر اپنے شناپ بولنا شروع کر دیا۔ ویسے تو ارجمند کو سینکڑوں چیزیں یاد تھیں۔
لہنگرا یونڈی ماباؤں۔ کیلے ریور یو پیٹے ریور پر یم سند لیں، پر یم لونا اور نہ جانے کیا کیا
لیکن ایلی کو اس کی انگرا یونڈی ماباؤں بہت پسند تھی ”دیکھو ایلی“، ارجمند چلاتا
”انگرا یونڈی ماباؤں کے لئے ریور یو پیٹے ریور یو کیا سمجھے“، اور ایلی حیران ہو کر
اس کی طرف دیکھتا۔ ہم سمجھاتے ہیں۔ ہم سمجھاتے ہیں مطلب ہے اُڑکی اجا بہسا نا
کیا مشکل ہے کچھ چکل نہیں۔ مصیب یہ ہے کہ یہاں محلے داری ہے۔ اگر دپنسری
ہو تو یوں پختی ہے یوں جیسے چکلی بجتی ہے اور پھر دپنسری پانی پت میں ہو تو
تو کیا بات ہے۔ آئی پختی، آئی پھنسنی، خیر کچھ پروانیں یہ دیکھو یہ
ریشمیں رومال کا ہونا بے حد ضروری ہے۔ اسے کہتے ہیں۔ کیلے ریور یو۔ سمجھے کیا
سمجھے۔ صرف ہونا ہی نہیں طریقہ استعمال بھی جانتا چاہئے۔ ”ہاں“ اور وہ رومال ہلا کر
کہتا ”لہذا ہم بتائیں گے یہ دیکھو۔ اسے تھامنے کی مشق کرو پہلے یوں نہیں بلکہ یوں
ہاتھ میں مرے ہوئے چوہے کی طرح نہ پڑا رہے بلکہ ہر چند منٹ کے بعد جنبش میں
آئے۔ اب منہ پونچ گرد جھاڑو۔ ذرا احتیاط سے جنبش کی خوبصورتی ہی میں
سارا جادو ہے۔ کیا سمجھے۔ لیکن ٹھہر ویسے کیلے ریور یو ہی کافی نہیں۔ اس پر سینٹ یعنی
خوبیوں کا چھڑ کنا لازمی ہے۔ یہ دیکھو شیشی چار آنے کی یہ شیشی، بیسیوں لڑکیوں کو
پھسلنے کے لیے کافی ہے ہاں تو ایس رومال سے گالوں کو سہلاو۔ گالوں کو جھاڑو
گرد پر لٹکا لو۔ ہاتھ میں رکھو۔ لڑکی دو رکھڑی ہو تو منہ پر چھڑ کا دے کر یعنی سلام عرض
کرتا ہوں اور یوں ہپلا یا تو مطلب ہے اب آؤ بھی نا جان مکن اور یوں چھاتی پر
پھینک لیا تو مطلب ہے ظالم سینے سے لگ جا اس کے استعمال کے کئی انداز ہیں۔
لیکن فی الحال یہی کافی ہے اس کے بعد یہ دیکھو۔ اس نے جیب سے ایک بانسری
نکالی اور نچلا ہونٹ لٹکا کر اس میں پھونکیں مارنے لگا ”یہ ہے پر یم سند لیں کہیں اندر
بند کمرے میں پیٹھی ہے تو یہ چیز اسے منڈیر پر لے آئے گی اور آخری چیز یہ ہے پر یم

ٹونا۔ دیکھا۔ ”اس نے ایک چھوٹی سی کتاب جیب سے نکالی۔ ”اس میں سب کچھ لکھا ہے محبت کے خطوط غزلیں، گیت ہر موقع کر لیے ”مثلاً یہ دیکھو“ اور وہ گانے لگا۔ ”جب سے تم پر ہوا ہوں شیدا نائٹ سلپینگ چھوڑ دیا۔“ بڑی لا جواب چیز ہے۔ سنتے ہی لڑکی بنسی تو سمجھو چکنی اور یہ سب کچھ کیا ہے انگرایندی مباوں۔“ ایلی اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور بے حد کمتر محسوس کر رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لڑکی پھنسانے کا مقصد کیا ہے۔ آخر اتنے بڑے انگرایندی مباوں کا کچھ تو مقصد ہو گا لڑکیا نہیں اسے تو میار غور نہیں اچھی لگتی تھیں۔ لڑکیاں خاصی لگتی تھیں۔ لیکن کوئی حاصل اچھی نہ لگتی تھیں اور اچھی لگتی بھی تو بھی انہیں پھسانے کا مطلب۔ اچھی لگتی تھیں نہیں اچھی لگتی تھیں اور نہیں اچھی لگتی تھیں۔ لیکن وہ ریشمی رومال اور بانسری اور پریم ٹونا پریم سندھیں وہ سب کس لئے تھے۔ خانم کی ابتو تو اور تھی نا۔ وہ تو بہت ہی اچھی تھی اور اس کا ہاتھ سے ایلی کو تھپکنا منہ سہلانا۔ کتنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن چھوٹی چھوٹی لڑکیا۔ وہ تو شرم سے آنکھیں جھکایتی تھیں۔ دور سے دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھیں خواہ مخواہ بننے جاتی تھیں۔ بے کار بے مصرف۔ اگر ارجمند کو لڑکیا اچھی لگتی تھیں تو ٹھیک تھا۔ لیکن وہ سب گور کھونا ہدایا۔ انگرایندی مباوں کیا تھا۔ فضول ہونہ ہو۔ ارجمند جانتا ہی کیا تھا۔ نہ تو اس نے خانم کو دیکھا تھا اور نہ کسی کو پانی پہت کے ہسپتال میں مریضوں کے ساتھ رہنے سے کیا ہوتا ہے۔

ہکوری ڈکوری

ایک روز ارجمند دوڑ اور ایلی کے گھر آیا۔ اسے اوہرا دھر آؤ بھاگ کے آؤ بھاگ کے آؤ۔ آؤ۔ ورنہ پچھتاوے گے۔ ساری عمر پچھتاوے گے۔ وہ ایلی کو اپنے گھر کی طرف گھینٹنے لگا۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ دو سے نے ہکوری ڈکوری بھی نہیں دکھایا۔ طلے آؤ آج گھر میں کوئی نہیں ہے۔ وہ سب پیر جی کے یہاں گئے ہیں۔ آداب و نیاز کے لئے اور ہم رہ گئے ہیں یہاں اندازو نماز کے لئے۔“

زن سے ایلی کے جسم میں بجلی سی دوڑگئی اس کے سر میں بھن بھن سا ہونے لگا جیسے
دنخواسر مکھوں کے چھتے میں بدل گیا ہو۔ دل گھڑی کی طرح بجھنے لگا۔ جنگلے کے پچھلے
دروازے میں ایک عورت کھڑی تھی۔ اس نے جسم پر ایک تو یہ لپیٹ رکھا تھا۔ ایک
طرف گلابی جسم پر سیاہ بال لٹک رہے تھے جنہیں بنانے میں وہ معروف تھی۔ دو بازو
بھرے بھرے سفید بازو۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے ہاتھ بال بنانے کے
بھانے اس کامنہ سہلا رہے ہوں۔ چھن چھن چھن چھن جنم جنم بجھنے لگا ارجمند جانے کیا کیا
کہے جا رہا تھا۔

دفعتاً بالوں کو جنہیں ہوئی اور۔ اور۔ ایک بڑا سا چہرہ دکھائی دینے لگا۔ چوڑا۔ چٹا۔ سفید و مخروطی بانجیں لٹکنے لگیں۔ —— ”انہوں“، ارجمند چلا یا ”یہ تو دوسرا ایڈیشن ہے یہ نہیں بڑا والا ایڈیشن نہیں بالکل نہیں ہمیں تو چھوٹا والا چاہیے چھوٹا والا چلو۔ میں یہ سب غلط ہے۔ یہ کوراؤ کوری نہیں۔ یہ تو کوراؤ کورا ہے۔ چلو۔“

ایل کا جی نہ چاہتا تھا کہ وہاں سے بڑے مگر ارجمند نے اس کا بازو کھینچ لیا اور اسے باہر لے گیا۔ سب غسل فرماتی ہیں۔ سب چھوٹا بڑا اسائز پر غسل فرمانے کے بعد اس کمرے میں ضرور آتی ہیں۔ تو یہ لپیٹنے کے دھانے کا مجزہ ہے۔ بڑی چیز ہے کچا دھا گا۔ لیکن یہ گھر کس کا ہے؟ ایل نے پوچھا کیونکہ وہ گھر محلے سے باہر تھا اور ایل کو معلوم نہ تھا کہ وہاں کوئی رہتا ہے۔ کسی کا بھی ہو۔ ارجمند نے کہا۔ ہمیں تو آم سے مطلب ہے پیر سے ہیں اور آم بھی وہ جو آم ہو طوہ کدو ہیں۔ مجھے ہمارے پاس آیا کرو گے تو یونہی عیش کرائیں گے۔

ہم جو لی لو لی

محلے میں ہر عمر کے لوگ کے تھے اور انہر یہ مطابق وہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے مثلاً ایک تو جیلیل یوسف اور رفیق کی اولیٰ تھی جو عمر میں اس سے بڑے تھے۔ جیلیل اس کی خال زاد بہن کا بیٹا تھا۔ رفیق اس کا ماموں زاد اور لطیف خالہ زاد بھائی۔ والدہ کی طرف سے اس کا قریبی رشتہ دار کوئی نہ تھا اور ہوتا بھتی تو کیا تھا۔ علی احمد پرانے رشتہ داروں کو خوش رکھنے کی نسبت نئے رشتے پیدا کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

رفیق جیلیل کا بڑا بھائی تھا۔ لیکن وہ جیلیل سے قطعی طور پر مختلف تھا۔ نہ تو اسے چوکی تلنے روپے رکھنے کا شوق تھا نہ حلوائی سے پیڑے کھانے کا اور نہ ہی بھیڑ والی دوکان سے اٹھنی کا سو دا خریدنے کا جیلیل کی طرف نہ تو وہ شوخ تھانہ دبلا پتا۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا رکھر کھاؤ تھا۔ جسم فربہ ہی پر مائل تھا۔ طبیعت میں خاموشی اور مٹھاس نمایاں تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بے حد ملنگا تھا۔ ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ لوگوں کے کام آئے۔ رفیق مزاج کا نگین تھا۔ لیکن یہ رنگ ہلکا ہلکا تھا مدم مدم سا، کبھی شوٹی سے نہ چمکا تھا۔ نہ ہی اسی کی طبیعت میں جرأت تھی کہ آگے بڑھ کر کچھ کہہ سکے اس کے رعناس وہ ڈھنی طور پر محسوس کئے جاتا اور اظہار کرنے کے وقت پیچھے ہٹ کر جھجک جاتا اس کے باوجود کے پاس ہر وقت انگرایندی ماباؤں کا سب سامان

مہیا رہتا تھا۔ جیب میں ایک آنے والی غزلوں کی کتاب ہاتھ میں خوشبو دار لیشمی رومال اور آنکھوں میض شوری چوری دیکھنے اور جھپکنے والی نگائیں۔

جلیل اس کے برعکس شان قلندری کا قائل تھا۔ آنکھوں میں رندانہ جھلک تھی۔ انداز میں والہانہ پین تھا اور یوسف بیچارہ قوان معاملات سے قطعی ناواقف تھا۔ سپاہیوں کے سکول ماسٹر کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے وہ کئی ایک سال فوجی پلشیوں میں رہا تھا اور شپختا بھاگنا، ووڑنا، کوڈنا، بالٹ کو کونک مارچ کے کھیلوں کو دنیا کی سب سے بڑی لذت سمجھتا تھا۔ اس کی طبیعت ڈر سے خالی تھی اور وہ کسی شیم الشان کارنامے کا متلاشی تھا۔ رفیق کی طبیعت میں بھی کسی کارنامے کی خواہش کی جھلک تھی۔ لیکن اس کی خواہش سے ریشمی ہابو سات عطریات جنائی بانگھوں کی بوآتی تھی۔ یہ تینوں لڑکے ایلی کے قریبی رشتہ دار تھے اور ایلی کا زیادہ وقت انہی کے پاس کرتا تھا۔ لیکن وہ تینوں عمر میں ایلی سے بڑے تھے اور ایلی سے چھپ چھپ باقی کرتے تھے۔ رفیق اور جلیل آپس میں رازدارانہ طور پر کچھ طے کرتے یوسف ان کی ایسی باتوں سے اکتا کر دیوار پر چڑھنے میں مصروف ہو جاتا اور ایلی ایک طرف کھڑا شدت سے محسوس کرتا کہ کاش وہ بھی ان کی باتوں میں شامل ہوتا۔

ارجمند کے گھر سے فارغ ہو کر ایلی رفیق اور جلیل کے یہاں چلا جاتا جہاں رفیق کے دوست اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ جلیل کا گھر محلے میں نہ تھا۔ یہ بہت خوبی تھی۔ کیونکہ وہاں وہ محلے والیوں کی نگاہوں سے دور جو جی چاہے کر سکتے تھے گھر میں جلیل کو ایک علیحدہ کمرہ ملا ہوا تھا۔ اس کمرے کی کھڑکی ایک گلی میں کھلتی تھی جس میں بوڑھی عورتیں چوکیوں پر پیٹھی رہتی تھیں۔ جب وہ وہاں سے سر کتیں تو جلیل اور رفیق چوری چوری باہر جھانکنے لگتے اور ان کا ریشمی رومال کھڑکی سے باہر لہانے لگتا۔ جسے دیکھ کر ایک ایک لڑکی جھاڑو دینے کے بہانے باہر گلی میں نکل آتی اور با آواز بلند کسی چچی یا خالہ سے باقی کرتے ہوئے خواہخواہ مسکراتے جاتی اور پھر دلیز پر جھاڑو

دیتے دیتے وہ آدمی سے زیادہ گلی صاف کر دیتی۔ اس وقت جلیل کھڑکی میں بیٹھ کر عجیب سی آنکھوں سے مسکراتا اور رفتی بے تابانہ اٹھ بیٹھا اور عالم اضطراب میں غزلوں کی کتاب سے کچھ گلنگا نے لگتا۔

نہ جانے وہ لڑکی گلی میں جھاڑو کیوں دیا کرتی تھی اور با آواز بلند باتیں کیا کرتی تھی۔ اس کی آواز میں لوچ کیوں پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کے انداز میں اس قدر شوٹی کیوں تھی اور جلیل اس وقت ایسی آنکھیں کیوں بنالیا کرتا تھا۔ جس میں بیک وقت مسکراہٹ بھی ہوتی اور وہ حشت بھی اور اس وقت رفتی کی آنکھوں میں بوندا باندی سی کیوں ہوا کرتی تھی؟

یہ تو ظاہر تھا کہ وہ سب کھلیں اس لڑکی سے متعلق تھا مگر اس کا مقصد کیا تھا یہ باتیں ایلی کیلئے حیران کن ہونے کے باوجود بے حد و پیچہ تھیں۔ رفتی اور جلیل میں یہ عیب تھا کہ وہ ایلی کو بات سمجھانے کی بجائے اس سے بات چھپانے کی کوشش کرتے اسی لئے ایلی ان کے ہاں بیٹھا بیٹھا اکتا جاتا اور ان کو چھوڑ کر ارجمند کی طرف بھا گتا۔

ارجمند سے دیکھ کر چلتا ”ایلی ایلی۔ چلو ایلی بڑی ڈیوڑھی میں چلیں۔“ اور وہ اپنا تمام تر انگرائیڈی مباوں اٹھا کر ڈیوڑھی میں چلے جاتے جہاں چورستہ بنا تھا لوگ آتے جاتے رہتے۔ ارجمند وہاں کھڑے ہو کر با انسری بجا تا اور آتی جاتی لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکراتا۔ مذاق کرتا اور وہ جھینپ کر مسکرا کر چلی جاتی۔ ”لا جواب چیز ہے ایلی۔ مگر ابھی نہیں کچھ سال کے بعد دیکھنا۔ وہ دیکھوٹا کے پیچھے۔

ارے تم تو انہوں کی طرح کھڑے رہتے ہو،“ اور ایلی کا دل دھک دھک کرنے لگتا اگر کسی نے دیکھ لیا تو محلے کا بڑا بیوڑھا ادھر سے گزرتا تو ایلی یوں کسی اڑتی ہوئی چڑھا کو دیکھنے لگ جاتا جیسے وہاں کھڑے ہونے سے اس کا مقصد صرف چڑھا دیکھنا ہو۔ ارجمند آنکھیں بند کر کے با انسری بجانے لگتا۔ محلے کے سب لوگ انہیں گھورتے

”اے اڑکوں یہاں کیا کر رہے ہو۔ خواہ مخواہ رستہ نہ روگو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“ یہ سن کر ایلی کو پسینہ آ جاتا اور ارجمند چپکے سے جواب دیتا۔ ”اچھا صاحب بھی چلتے ہیں۔ ذرا انتظار کر رہے ہیں بھائی صاحب کا،“ ارجمند کو بات ٹالنے میں کمال حاصل تھا۔

جلیل اور فیق کے علاوہ محلے میں ایک ٹولی تھی۔ اجمل صدر اکرم دین محمد اور غلام بخش کی۔ یہ ٹولی محلے کے جوانوں کی تھی۔ وہ جلیل اور فیق سے بھی الگ تھلک رہتے تھے۔ جوانوں کی اس ٹولی کے مشاہل تھے میں ترتیب دیئے جاتے تھے۔ وہ منظم نام پر کوئی ایسی حرکت سر زدنا کرتے تھے جس ہر محلے والیوں کو ان پر نکتہ چینی کرنے کا موقعہ ملے چونکہ محلے والیوں کو جوانوں سے چڑھتی۔ وہ چھوٹے بچوں سے پیار کرتیں لیکن جوں جوں وہ بڑا ہوتا جاتا توں توں وہ ان کی نظروں میں کھلتا۔ حتیٰ کہ جوان ہو کر وہ مشکوک ہو جاتا اور اس کے ہر فعل پر محلہ والیاں چونک کر دیکھتیں اور چہ میگویاں کرتیں۔ اس ٹولی کا کوئی فرد جب باہر چوگان میں نکلتا تو محلے والیوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتیں جیسے وہ کوئی خطرناک ارادہ رکھتا ہو۔ محلے میں جوان ہونا جرم سمجھا جاتا تھا اور جوانوں کو اس بات کا پورا احساس تھا۔ لیکن وہ مجبور تھے ان کا احتجاج دبا دبایا رہتا اور ان کی پیشتر قوتوں میں بزرگوں کے خلاف احتجاج اور سازش کرنے میں صرف ہو جاتیں۔

اجمل دویس جماعت پاس کر کے اب کالج میں پڑھتا تھا اور کبھی کبھی چھٹی پر محلے میں آ جاتا تھا۔ اکرم ارجمند کا بڑا بھائی تھا اور وہ اتنا مبارک تھا کہ بڑی ڈیورٹھی کے علاوہ کسی دروازے سے بھکے بغیر گز نہ سکتا تھا۔ وہ شملے میں نو کرتھا اور کبھی کبھار چھٹی لے کر محلے میں آیا کرتا تھا۔ دین محمد علی پور میں دکان تھی اور وہ پتلہ دبلا ہونے کے با وجود بڑا معزز زینا پھرتا۔

صدر کو دیکھ کر تو ایلی بڑا مایوس ہوا تھا کیا یہ وہی صدر تھا جو دلی میں پارسی اڑکی سے

محبت کیا کرتا تھا اور صبح شام پارسی تھیز میں رہا کرتا تھا۔ وہ تو بالکل ایک سیدھا سادا نو جوان تھا۔ جس میں ذرا بھی پارسی جھلک نہ تھی۔ بہر حال اس میں ایک خوبی ضروری تھی۔ جب وہ کوئی تھیز کی دھن گلنگا تا تو اس کی آنکھوں میں عجیب بونداباندی سی ہوتی گلابی گلابی بوندیوں کی پھوٹ پڑتی۔ اس کی چوڑی کلائی پر فلیے رنگ کی سیاہی میں نہ جانے کیا کھدا تھا جسے وہ اکثر دیکھتا اور پھر کسی خیال میں کھو جاتا۔ اس کی طبیعت بہت نکلین تھی۔ رفیق کی طرح ولی دلبی رنگینی نہیں بلکہ چیلکتی ہوئی رنگینی ابلتا ہوا جوش لیکن جسمانی طور پر اس پر بحود طاری رہتا تھا۔ جیسے وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا ہو۔ غلام بخش کی آنکھیں اُخڑ چھوٹوں تلے پچھے ڈھونڈ لئے میں مصروف رہتیں اور اس کی چھاتی تنی رہتی۔

کبھی کبھار محلے کی ان تینوں ٹولیوں کا میل بھی ہو جایا کرتا۔ سب سے بڑی ٹولی یعنی محلے کے جوان محلے کے نوجوانوں کو بلا تے چلو بھی آج کر کٹ کا کھیل رہے گا۔ محلے کے نوجوان محلے کے لڑکوں مطلع کر دیتے۔ کھیل کی خبر سن کر لڑکوں کی با چھیں کھل جاتیں اور وہ گیندا بلا اور وکٹیں اٹھا کر قبے سے باہر تالاب والے میدان کو چل پڑے۔ پھر جب وہ میدان میں وکٹیں گاڑ کر سنٹر ناپ کر تیار ہوتے تو محلے کے جوان آپنے ان کے آتے ہی نوجوانوں کی حکومت کا دور ختم ہو جاتا رفیق اپنا خوشبو دار ریشمی رومال چکے سے گردن سے ہٹا کر جیب میں ڈال لیتا اور ارجمند اپنا شوخ انداز ترک کر کے مودبانہ کھڑا ہو جاتا۔ صفر اور اکرام آ کر ایک نظر میدان پر ڈالتے۔ صدر پا تھے میں گیندا ٹھا تا اور تمیض کی آستینیں چڑھاتے ہوئے ایک بار بازو پر کھدے ہوئے حروف کی طرف دیکھ کر سر جھلکتا اور تھیز کی دھن گلنگا نے لگتا۔ ”حافظ خدا تمہارا۔“ اس وقت ایلی کی آنکھوں سے وہ میدان اوچھل ہو جاتا اور تھیز کے منظر پر ایک پارسی لڑکی آ کھڑی ہوتی۔ ”اے ملبا میں ہوں ندا۔“ صدر کے مضبوط بازو اس کی جانب بڑھتے اور وہ جھینپتی۔

”اے میلی تم ادھر جاؤ شاپ کے پاس۔“ ایلی چونک پڑتا۔ ”ناتم نے“، اکرم گردن جھکائے چلاتا اور غلام بخش خاموش تھی ہٹنے لگتا۔ ایلی کو اس وقت معلوم ہوتا کہ وہ میدان میں کھڑا ہے۔ تھیٹر میں نہیں اور کھیل شروع ہونے والا ہے۔

اصفی اڑ کے کڑ کٹ کھیلنے کے بہت شوقین تھے اڑ کے تو محلے ہی میں گیندا اور جنختی سے کر کٹ کھیل لیا کرتے تھے۔ مگر جوان اور نوجوان صرف میدان میں گیند بیٹے سے کھیلتے تھے۔ صدر گیند جھنگنا کا بے حد دشوقین تھا اکرم لمبا ہونے کی وجہ سے بہت زور سے ہٹ لگاتا تھا اور غلام بخش صرف گیند رونے کا مشائق تھا۔ اکثر بیچ بھی ہو جاتے تھے۔ جس میں ایلی کا کام صرف کھاڑیوں کی چیزوں کی رکھوائی کرنا ہوتا تھا۔

بہر حال اسے بیچ میں شامل ہونے سے بڑی پیچی تھی۔

بالا

اوڈپیپیوں کے علاوہ محلے میں ایک اور دلچسپی تھی اور وہ بالا تھا جو بذات خود ایک ٹولی تھا اپنے آپ میں اس قدر مگن رہتا تھا کہ اسے کسی کے ساتھ مل بیٹھنے کی خواہش ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ بالا ایلی کا ہم عمر تھا اور اس مکان میں رہتا تھا جو ایلی کے مکان کے عین سامنے واقع تھا۔ صحیح سوریے اسی بالا کراپنے بہت بڑے تخت پوش پر چیزوں سے سجانا شروع کر دیتا۔ یہ گراموفون ہے یہ ریکارڈ ہیں۔ یہ منہ سے بجائے والا بار مونیم ہے اور بیتاش کی گذیاں ایک دو تین۔

تخت پوش پر چیزوں سجائے کے بعد وہ ان کے درمیان بیٹھ جاتا اور پھر چیزوں کو بنانے سنوارنے اور ادھر سے ادھر ادھر سے ادھر رکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ ”یہ نیلم ہیں اور یہ زمرہ وہ اس ڈیبا میں ہونے چاہیں۔“ وہ آپ ہی اپ گنگنا تارہتا۔ ”یہ۔ ہائیں۔ آج اس کا رنگ مدھم کیوں پڑ گیا۔ ہاں آج بدھ ہے نا، بدھ تھت تھت بدھ کو پکھرائی کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے اور لعل کافھرتا ہے۔ لوٹل کہاں ہے۔ آج بھائی ایلی ہے۔ آجاؤ بھائی ایلی یہاں میرے سر آنکھوں پر۔ ہی ہی میں

دیکھ رہا تھا کہ لعل کہاں ہے۔ پکھر اج یوں چمک رہا ہو گایوں جیسے پاش کر رکھا ہو۔ یہ
قیمتی پتھر حساب کے مطابق چمکتے اور پچکے پڑتے ہیں۔ ہاں تو ہل کہاں ہے۔ ہی ہی
ہی اٹھا کے لے جاتے ہیں۔ بڑا نگ کرتے ہیں۔ بیچارے بڑے اچھے ہیں۔ ہی
ہی ہی ابھی مجھے ڈیوڈھی میں ملا تھا ایک کہنے کا۔ نیچے کنوئیں کے پاس ایک دیگر نیلم
اور پکھر اج کی بھری ہے۔ وہ تو ہمیں پتہ ہے کبھی جانتے ہیں اور وہ روزانہ دیگوں کو
ادھرا دھر کرتے رہتے ہیں۔ رات بھر آوازیں آتی رہتی ہیں وہ انہیں ادھرا دھر کرنے
میں ساری رات ساری رات چھن چھن ہوتا رہتا ہے۔ تھقہے مارے ہیں روتے ہیں
چیختے ہیں اچھاتا شکھلو گئے اور بھلا تھمیں جانکی بانی کاریکار رُسانا ہیں۔ بیاں موری
مردڑ، ہی ہی بڑا اچھا ہے۔ بڑیں یہ گرفہ اگر روپڑ جائے تو ریکارڈ خراب ہو جاتے
ہیں۔ بت بت بت بت ہی ہی لو سنو۔

ایلی بالے کو دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔ اسے یہ چیزیں کون دیتا تھا۔ وہ کون تھے جو اس
کے گھر میں رہا کرتے تھے اور اسے نگ کرتے تھے اور اسے بالکل نگ نہ کرتے تھے
اور کنوئیں والے کمرے کے نیچے کیا دباؤ ادا کرو تھا اور وہ دیگریں کسی تھیں۔

سارے محلے میں مشہور تھا کے بالے کا گھر آسیب زدہ ہے اس لئے کہ مالی عمدہ
نے وہاں چلم کا نا تھا۔ اور جب وہ آخری رات ایکلی وہاں بیٹھی ہوئی تھی تو دو کئے
ہوئے بازو اس کے سامنے آگرے تھے اور پکھر ساری کا سارا دھڑ دھم سے آ کر اور سر
کھرا ہو گیا اور پھر وہ بھاگی ڈر کر بھاگی اور لوگوں کے دروازے کھلکھلانے لگی۔ اس
کے پیچے قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لوگوں نے ڈر کے مارے
دروازے بند کرنے۔ پھر عمدہ چینیں سنائی دیں اور پھر خاموشی چھاگئی اور صبح عمدہ بے
ہوش پڑی ملی اور اس کے گرد گندگی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

اصفی محلے میں کئی ایک مکانات اور مقامات کے متعلق ایسی ہی باتیں مشہور تھیں۔
چچی عظمت کے چوبارے کی کھڑکی آپ ہی آپ کھل جاتی تھی اور اس میں سے بے

موسم کے میوے گرتے تھے۔ شیخاں کی حوالی کی سب سے اوپر والی منزل سے رات بھر آوازیں آتی تھیں۔ حسن دین کی دیواری میں کوئی بزرگ رہتا تھا وہاں ہر جعرات کو دیا جلایا جاتا تھا۔ ایلی کے گھر کا چوبارہ بھی آسیب زدہ تھا اور رحمت بی بی کے کوٹھے پر تو لوگوں نے آگ جلتی دیکھتی تھی۔ محلے میں عمدہ کے علاوہ کئی لوگوں نے بھی ونطائیں پڑھتے تھے اور وہ چلم پورا کرنے میں کامیاب رہے تھے۔

محلہ والیاں

اس کے باوجود پچھے آزادانہ ہر جگہ گھلتے تھے اور محلے کی بوڑھی عورتیں انہیں گھورتی تھیں۔ ”کھیل کو دکا وقت ہوتا چاہئے۔“ وقت اللہ مارا گیند بیا اور پھر ہر وقت چیخ پکار اور اس پلید گیند کے چھینٹے ان لوگوں کو قوت اللہ ہی سمجھے۔ دیکھو تو کیا حال بنا رکھا ہے۔“ دوسرا کھڑکی سے جھانکتی ”ٹھیک ہے بہن لیا زمانہ آیا ہے۔“ بڑے بات کریں تو یہ منہ چڑھاتے ہیں۔“ تیسرا بولتی ”اب تو زمانہ ہی بدلت گیا نہ بڑے کا خوف نہ بوڑھے کا لحاظ۔“ پچھے انہیں دیکھ کر بھاگ جاتے اور وہ وہاں کھڑی گھنٹوں نے زمانے پر لپکھر دیتی رہتیں اور چھپے ہوئے لڑکے ان کا منہ چڑھاتے،“ ہوں بڑی آئیں!“

محلے کی بوڑھیاں محلے کے نوجوان بچوں اور بوڑھوں پر آکا شیل کی طرح چھائی ہوئی تھیں حتیٰ کہ محلے کے تمام مرد بھی ان سے دبجتے تھے۔

بوڑھی چڑھیل

لڑکے سب سے زیادہ ایلی کی دادی سے ڈرتے تھے کیونکہ وہ ہر بات پر انہیں ڈانتی تھی۔ ایک بار بات شروع کرتی تو پھر مسلسل لپکھر دیتے جاتی۔ حتیٰ کہ اس کے منہ سے کف جاری ہو جاتے۔ اسکی آوازن کر سب بھاگ لیتے تھے اور پھر کسی شنگ گلی میں چھپ کر اس کا منہ چڑھاتے۔ نوجوان اسے چڑھیل سمجھتے تھے۔ جوانوں میں صفر کو تو اس کے نام سے وحشت ہوتی تھی۔“ مجھ سے تو پیر ہے اس بڑھیا کو خواہ مخواہ ہر

بات میں میرا نام گھینٹ لیتی ہے۔“

ایلی کی دادی کو محلے کے رکوں سے سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ اس کی دیوار کے ساتھ گیند کھیلتے تھے۔ جس سے دیوار کمزور ہوئی جا رہی تھی۔ اس پر صدر کو اتنا غصہ آتا تھا کہ گھر بیٹھ کر بڑے اہتمام اور محنت سے پونا ش کا ایک اتنا بڑا پٹا خہ تیار کرتا تا کہ تھوار کے دن دادی اماں کی دیوار پر مارے۔ پٹا خہ چھوٹتے ہی زنا لے کی آواز آتی اور دادی اماں کھڑکی میں جا لظری ہوتی۔ ”اے ہے جوانوں کے سر پر تو بجھوت سوار ہے۔ خون جھپٹھا ہوا ہے۔ یہ تو محلے کو تباہ کر کے رہیں گے۔“

داؤی اماں کو چیختے سن کہ صدر کو عجیب سی رحانی میرت حاصل ہوتی وہ اطمینان
سے گانے لگتا۔ ”اے مل بائیں ہوں جدا۔“ ان تمام باتوں کے باوجود دایلی کو یقین نہ
آیا کہ داؤی اماں سخت مزاج ہیں حالانکہ جب بھی وہ گھر جاتا تو داؤی دور سے اے
دیکھ کر بر سر پڑتی ”بس تو بھی اب کہیں کانہ رہا۔ ان کے محلے کے لڑکوں میں کھیل کر
تو بھی گزر گیا۔“ لیکن ایلی اس کی جھٹکیوں کی پرواہ کرتا اور اس کے کندھوں پر سوار
ہو جاتا اور وہ شنگ آ کر کہتی : ”کتنی دیرے پیشی انتظار کر رہی ہوں کتو آئے تو مجھلی
کھانے۔ صح سے تیرے لئے پکا پیشی را تک رہی ہوں۔“ یہ کہہ کروہ کڑا ہی کاڑھکنا
اٹھاتی۔ کڑا ہی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں سے بھری ہوتی۔ ایلی چھوٹی مچھلیا کھانے کا بہت
شووق تھا۔ وہ کڑا ہی اٹھا کر بھاگ جاتا اور داؤی پھر سے اسے کوئی نہ لگتی اور چور چوری
منہ پر پلہ لے کر مکاتی بڑا شیطان ہو گیا ہے نکما کہیں کا۔

دادی اماں کے ساتھی ایلی کی پچھوپچھی زاد بہن سیدہ رہا کرتی تھی جو ہر وقت دادی کے پاس بیٹھی رہتی اور دادی اماں کے کام کیا کرتی تھی۔ سیدہ کو دیکھ کر ایلی حیران ہوتا کہ وہ نوجوان ہونے کے باوجود دادی اماں کی طرح سر لگائے بیٹھی رہتی ہے۔ شادی ہو جانے کے باوجود اپنے میاں کے پاس کیون نہیں رہتی اوس کی شکل اتنی غم

آلودگیوں ہے اور اس کے میاں کہاں رہتے ہیں اور وہ وہاں آتے کیوں نہیں؟ سیدہ کو دیکھ کر ایسا موضع میں پڑ جاتا۔ لیکن اسے سیدہ سے یہ باتیں پوچھنے کی کبھی جرأت نہ ہوتی تھی۔ ادھر اونچے چوبارے میں سیدہ کی بہن نیاز اپنے تینوں بچوں کے ساتھ رہتی۔ اس کی حالت سیدہ سے بھی بدتر تھی۔ یا تو وہ چپ چاپ پڑی رہتی اور یا اٹھتی تو نماز پڑھنے لگتی ہو جاتی۔ محلے کی بہت سی عورتیں اسی طرح رہتی تھیں جیسے پیپ سے بھرنے پھوڑے ہوں جیسے ان کے دل دکھتے دکھتے پھوڑے بن چکے ہوں۔ اس کی اپنی ماں تو ان سب سے مختلف تھی۔ وہ دن بھر بیسوں کام کیا کرتی تھی۔ کبھی کپڑے سیچی، کبھی گوٹا لگاتی۔ کبھی بچوں کے لئے گزیابانے لگتی۔ کبھی کسی دو لہاکے لئے عروجی گلزاری تیار کرتی اور ایسا پینگ اڑا کر کبھی تو وہی دیتی تھی۔ ایسا کو پینگ اڑانا نہیں آتا تھا۔ ہاجرہ اسے خود پینگ بنانے کر دیا کرتی تھی۔ اس کی کتابوں پر خود ہی جلد چڑھایا کرتی تھی۔ ہاجرہ کو دنیا بھر کے سب کام کرنے آتے تھے۔ نہ جانے اس نے اتنے سارے کام کہاں سے سیکھ رکھے تھے۔

طوفانا

اہمی وہ محلے کی زندگے سے پورے طور پر محفوظ نہ ہونے پایا تھا کہ ایک روز علی احمد اور صفیہ آگئے۔ داوی اماں انہیں دیکھ کر چلائی ”علی احمد تو“۔ ”ہاں“ انہوں نے لا پرواہی سے کہا ”یہ بیکار ہے۔“ ہاجرہ نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ ”الله خیر کرے۔ کون بیکار ہے کہیں صفیہ تو۔۔۔۔۔“ صفیہ کے آنے پر سارا محلہ ان کے گھر جمع ہو گیا۔ ”اے کیا ہو صفیہ کو۔“

”کوئی صفیہ کیا بات ہے۔ کون سی تکلیف ہو گئی تھی؟“ صفیہ کا رنگ زرد ہو چکا تھا اور وہ پینگ پر پڑی کھانستی رہتی تھی۔ ”آرام آجائے گا۔ تو خواہ مخواہ فکر کرتی ہے۔“

ایلی نے صفیہ کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ کی مہندی بالکل اڑ چکی تھی۔ انگوٹھیاں اور بھی میلی ہو گئی تھیں۔ مگر اس کا جسم ویسے کا ویسا ہی تھا۔ ماتھے پر سنکن اسی طرح پڑی تھی۔ ایلی کو یقین نہ آتا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ وہ اس کے قریب جاتے ہوئے دستا تھا کہ کہیں ایک دم اس پر جھپٹ نہ پڑے۔ اگر وہ بیمار تھی تو اسکی تیوری کیوں چھپی۔ بیمار تو گھورانہیں کرتے نہیں نہیں صفیہ بیمار نہیں اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔

اس کے باوجود صفیہ بیمار تھی اور لوگ روزانہ اس کی عیادت کے لئے ان کے گھر آیا کرتے تھے۔ وہ چپ چاپ چارپائی پر پڑی رہتی اور جھپٹ کی طرف دیکھتی رہتی۔ ”اے ہے تو اس فکر میں پڑی ہے۔ لڑکی،“ ” محلہ والیاں اسے پیار سے گھورتیں۔“ انشاء اللہ رب حکیم ہو جائے گا۔ ذرا بہرہ یہ ز کا خیال رکھا اور بس۔“ لیکن ان باتوں کے باوجود صفیہ کا جھپٹ کو گھومنا نہ کیا۔ سارا دن وہ جھپٹ کو گھورتی رہتی اور ہاجرہ اس کی چارپائی کے گردیوں گھومتی رہتی۔ جیسے ہاجرہ شہنشاہ بابر ہوا اور صفیہ اس کا بیمار بیٹا ہمایوں۔

پھر شام کے وقت جب گرمی بڑھ جاتی تو ہاجرہ صفیہ کو سہارا دیتی اور وہ آہستہ چلتی ہوئی اسے کوٹھے پر لے جاتی تا کہ کھلی ہوا میں سوکے۔ ایک رات جب وہ سب کوٹھے پر سو رہے تھے تو آندھی چلنے لگی۔ بونداباندی ہونے لگی۔ ہاجرہ کا خیال تھا کہ جلد ہی آندھی ٹھم جائے گی، اس لئے وہ صفیہ کو اٹھا کر بر ساتی میں لے لے گئی تا کہ اسے نیچے گرمی میں تکلیف نہ ہو۔ یہ آندھی ایک عام آندھی تھی۔ آندھیاں اکثر آیا کرتی تھیں۔ چند ایک منٹ کے لئے تیز ہوا چلتی بادل گر جتا چھینٹے پڑتے اور پھر مطلع صاف ہو جاتا۔ علی احمد سیدہ اور داوی اماں کے نیچے چلے جانے کے بعد وہ آندھی طوفانی صورت اختیار کر گئی۔ ہاجرہ گھبرا گئی۔ ہاجرہ کے لئے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کی مدد سے صفیہ کو نیچے لے جانا مشکل تھا۔ طوفان اور بھی تیز ہوتا گیا۔ ہوا مکانوں اور دکانوں سے ٹکر اٹکرا کر بیوں چیخنے لگی، یہے جنگل میں شیر دھاڑتا ہے۔ آسمان پر سیاہ

رنگ کی گھٹا چھا گئی۔ بجلی کی کڑک سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ ایلی اور فرحت جا گف پڑے۔ وہ دونوں ڈر کر رونے لگے۔ ”اماں، اماں، اماں۔“ ادھر مریضہ کراہ رہی تھی۔ بر ساتی میں دو ہلے محراب تھے، جن پر پٹ نہیں لگایا ہے تھے۔ ان محربوں میں ہوا چنگل حاضر رہی تھی۔ ہاجرہ نے چلا چلا علیٰ احمد، دادی اماں اور سیدہ کو آوازیں دیں، لیکن طوفان کی شدت کی وجہ سے اس کی آواز پھلی منزل تک نہ پہنچ سکی۔ طوفان کی شدت کے ساتھ مریضہ کی حالت بکریٰ جا رہی تھی۔ ہاجرہ گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ مریضہ کرہڑی رہی تھی۔ بچے رورہے تھے۔ ہوا بے تحفظ اڑ کھنے کے لئے اس نے چار پاپائیوں مریضہ کے گروہ کھڑی کر دیں اور ایلی اور فرحت سے کہا کہ انہیں تھامے رکھیں مگر ہوا کے جھونکوں نے چار پاپائیوں کو اٹھا کر پھینک دیا۔ دونوں بچے چار پاپائیوں کے ساتھ دیوار سے ٹکرائے۔ بچے ڈر کر چینیں مارنے لگے۔ پھر دھڑا ان کی نگاہ مریضہ پر جا پڑی۔ مریضہ دیوانوں کی طرح سر چلا رہی تھی۔ اس کا سر اور آنکھیں گھڑی کے پنڈولم کی طرح بل رہی تھیں۔ آنکھیں تھرائی جا رہی تھیں۔ دم اکھڑ رہا تھا۔ ہاجرہ گھبرائی۔ روئے ہوئے بچے سہم گئے با دوباراں کے اس طوفان کی نسبتوہ طوفان جو مریضہ کے سینے اور آنکھوں میں چلتا ہوا محسوس ہوتا تھا، کہیں زیادہ بھیا نک تھا۔ ان کی توجہ پیر و فی طوفان سے ہٹ کر صفیہ کی طرف مبذول ہو گئی۔ ”میں جاتی ہوں۔ میں کسی کو بلا تی ہوں۔“ ہاجرہ گھبرا کر چلائی۔ صفیہ کا سر انکار میں اور بھی شدت سے ہلنے لگا۔ پھر ایک ساعت کے لئے صفیہ کا سر ٹھیم گیا۔ اس کی آنکھوں کی وہ بھیا نک مردی کم ہو گئی۔ اس نے پونٹوں پر زبان پھیری۔ صفیہ نے ہاجرہ کا ہاتھ تھام لیا۔ میں میں نے تیری قادر نہ کی۔ اس کی نگاہ میں بے بسی کی ایک عجیب جھلک تھی۔ چند ساعت کے لئے اس نے اپنی نگاہیں ہاجرہ پر جمائے رکھیں پھر اس کی آنکھ سے ایک موٹا آنسو ڈھلک آیا اور گال سے پھسل کر بالوں میں کھو گیا۔ پھر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور بازو گر کر لٹکنے لگا اور سر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گیا۔

”اماں“ ایلی نے چیخ ماری۔ ہاجرہ نے سر پیٹ لیا ”صفیہ“ صفائی۔

ایک فقیر

طوفان نہم چکا تھا۔ نیچے بڑے کمرے میں پنگ پر صفیہ کی لاش پڑی تھی اور اس کے گرد محلہ والیاں بیٹھی باتوں میں مشغول تھیں۔ صفیہ کا جسم چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن اس کا جو نہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایلی نے دو ایک بار صفیہ کی طرف دیکھا، اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ موت کا بہانہ کر کے پڑی ہو۔ جیسے ابھی جاگ اٹھے گی۔ کہے گی ”ایلی بازار سے دو دھلانہ“۔ ہاجرہ تو میری یماری کا بہانہ کر کے آرام سے بیٹھی ہے۔ چال اٹھا رتن صاف کر چل اٹھ۔ لاش میں جیجھ ہوئی۔ ایلی کا دل ڈوب گیا۔ صفیہ کا جو نہ اکھل کر لکنے لگا۔ محلہ والوں نے با آواز بلند کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ایلی جیخ ماگر بھاگا ”دادی اماں، دادی اماں۔“ دادی نے اسے تھام لیا۔ ”تو کیوں بیٹھا ہے۔ یہاں ادھر آمیں تجھے سلا دوں۔“ دادی اماں نے اسے بازو سے کھینچتے ہوئے کہا۔

صفیہ کی وفات پر ہاجرہ کئی دن تک روئی رہی۔ رہ رہ کر صفیہ کا وہ فقرہ یا داؤ تھا۔ ”میں نے تمہاری قدر نہ کی۔“ اس وقت اس کی آنکھوں میں خبر بھری چمک لہراتی اور گالوں پر آنسو بننے لگتے۔ برسوں کی خدمت گزاری اور عشق کے بد لے اسے ایک فقرہ ملا تھا۔ ”میں نے تمہاری قدر نہ کی۔“ ہاجرہ اس فقرے کو تمجھ کی طرح سینے پر لگائے پھرتی تھی۔ اس ایک فقرے کی وجہ سے برتری میں بدل گیا تھا۔ وہ اس ایک فقرے کی خاطر ایک بار پھر عمر بھر کی خدمت گزاری میں بس رکھتی تھی۔

صفیہ کی موت سے علی احمد کے گھر کے روزمرہ میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔ ایلی اسی طرح ارجمند سے انگرایندی ماباؤں کی تفصیلات سمجھتا رہا اگرچہ عملی طور پر ان تفصیلات کا کوئی نتیجہ ظاہرنہ ہوا۔ کبھی کبھار کھڑکی کی درز سے وہ ہکوری ڈکوری کے مختلف سائز دیکھتا رہا۔ محلے کے جوانوں کے ساتھ کرکٹ کے میدان میں جاتا رہا۔

جلیل اور رفیق کے ساتھ قاضی دروازے کے پاس اس ٹگ گلی میں جھاڑو دینے والی شوخیوں کو بغور دیکھتا اور دادی اماں کے ساتھ لپٹ کر سوتا رہا۔

ہاجرہ اسی طرح دن باور پھی خانے میں برتن ماجھتی۔ کھانا پکاتی اور علی احمد کی چمیں بھرتی رہی اور فرحت حسب معمول گھر کے کام کرنے کے علاوہ سہلیوں کے گھروں کے چکر لگاتی رہتی اور دادی اماں اسی طرح گھٹشوں میں سردیئے چوہے کے پاس بیٹھی رہی اور اس کے پاس سیدہ خاموشی سے نکلوں سے زمین کریدتی رہی اور علی احمد وہی پھٹی ہوئی میلی وھتوں باندھے دیک کے رجسر میں لکھتے رہے اور محلہ کی چپگاڑیں رات کو حاجاٹ پر چیخ چیخ کر منڈلاتی لایں۔ بچے کھلتے رہے۔ بوڑھیاں انہیں گھورتی رہیں اور محلے کے بوڑھے نماز ادا کرنے کے بعد کھانتے ہوں سر لگائے گھروں کے دروازے ٹھکھاتے رہے اور صدر دادی اماں کی دیوار پر پھینکے کے لئے پھحل پوشاں کے پلان خ تیار کرتے ہوئے گلگتاتا رہا۔ ”حافظ خدا تمہارا۔ اے درباہوں میں فدا۔“

سارہ صبورہ

پھر ایک دن علی احمد کے یہاں مهمان آگئے۔

”ہاں یہیں مکان تو ہے۔“

”تم آگے چلی جاؤ۔ گھبرا نے کی کیا بات ہے۔ اے ہے تمہارا اپنا محلہ ہے۔“ چی جی حاجاں کی آواز آئی۔

”کون آیا ہے۔ چاچی؟“ ماں جیوال بولی۔

”اپنے علی احمد کے مهمان آئے ہیں۔“

”کون مهمان آئے ہیں۔ چاچی کن کے گھر آئے ہیں؟“

”مہمان آئے ہیں۔“ دادی اماں نے سراٹھا کر دیکھا۔ ”دیکھ تو لڑکی کون مهمان آئے ہیں۔ شام کوٹ سے تو نہیں آئے۔“

”کون آیا ہے؟“ علی احمد قلم دیسک پر رکھتے ہوئے بولے اور پھر حسب عادت جلدی سے تمیض پہنچنے لگے۔ باجرہ باور پی خانے سے نکل کر چپ چاپ دروازے میں آکھڑی ہوئی اس کی آنکھیں ابھی سے پر نم ہو رہی تھیں کہ شاید مہماںوں کے آتے ہی صفیہ کی موت پر اظہار افسوس گرنے پڑے۔ شاید وہ آتے ہی اسی غرض سے ہوں۔ ایسی سہم کر کھڑا ہو گیا پر فرحت اپنا دو پٹھ سنبھالے گئی۔ سب بیٹھیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ بیٹھیوں سے بلکہ بلکہ تھکھوں کی آواز سنائی دیں۔ کوئی نہ رہی تھی۔ جیسے سکول کی لڑکیاں نہیں ہیں۔ ایک کہہ رہی تھیں۔ ”تم چلو جیا۔ چلو جھی نا۔“ دوسری بولی ”تو خواہ مخواہ جھکھتی ہے۔ پھر کوئی سر لیں آؤ اذیں نہ پڑنگی جیسے گھنیشاں نج رہی ہوں۔

”اے ہے کون ہے؟“ دادی اماں بولی۔ ”آ جاؤتا اوپر۔“

”سلام کہتی ہوں۔“ وہ دونوں دروازے میں آکھڑی ہو گئیں۔ ”فرحت کہاں ہے؟“

”ہائے۔“ فرحت چلائی۔ ”یہ تو سارہ صبورہ ہیں۔“ اور بھاگ کران سے لپٹ گئی۔ ”کون ہیں۔ دادی اماں؟“ اخاطے سے عورتوں نے پوچھنا شروع کر دیا۔

”کون آیا ہے؟“

”لڑکیاں ہیں۔“ دادی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ ”اپنی فرحت سے ملنے آئیں۔“

”اپنی ہی بچیاں ہیں اللہ عمر دراز کرے۔“

”بڑی دوسرے آئی ہیں۔ خیر سے۔“

”ہاں چاچی سہیلیاں جو ہو گئیں۔“

”اچھا کیا جو ملنے آ گئیں۔“

”کیا نام ہیں لڑکیوں کے؟“

چند ایک ساعت میں محلہ بھر میں یہ خبر پھنس چکی تھی۔ جیسے تالاب میں پھر پھینکتے ہی دیر تک محلے میں وہ لہریں ناچھتی رہیں پھر سکون طاری ہو گیا۔ لیکن علی احمد کے گھر میں ایک دبادبا طوفان اجبر رہا تھا۔ اور ہر بڑے کمرے میں با جرہ فرحت سارہ صبورہ بیٹھی با تین کر رہی تھیں۔ کمرے سے ہلکے لطیف تھقہ سنائی دے رہے تھے۔ ایسے رنگین تھقہ جو محلے کے کسی گھر سے بھی نہ دیتے تھے۔ باہر دادی اماں چوہنے پر گھنٹوں میں سردیتے بیٹھتی تھی اور اس کے پاس سیدہ سرہا گھوں میں تھامے تیل سے بھری گڑا ہی کو حضرت ناگ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی لامدہ علی احمد قمیض پہنے بار بار چور نگاہوں سچھانتے اور پھر تھتے کش لینا شروع کر دیتے اور کھانتے۔ پھر وہ ایک دم اضطرابے آواز دیتے۔ ”ایلی کی ماں حفہ بھر دو۔“ پھر قلم اٹھا کر لکھنے کی کوشش کرتے اور پھر کھانے لگتے۔ ”ایلی کی ماں کون آئی ہیں؟ لڑکیاں ہیں۔ اچھاؤ دو را ہے سے آئی ہیں۔ دورا ہے میں یہ لوگ رہتے کہاں ہیں؟ چھائک والے محلے میں۔ اچھا وہ جو بزر کھڑکیوں والا مکان تھا وہاں۔۔۔۔۔۔ ہوں تو اپنے قاضی اظہر حسین کی بیٹیاں ہیں۔ لوتم نے پہلے کیوں نہ بتایا۔ وہ تو بالکل اپنے ہی ہیں۔ ہی ہی ہی۔ جب ہم دورا ہے دو رے پر جایا کرتے تھے تو قاضی اظہر ہی کے گھر رہا کرتے تھے۔ بڑے اچھے تعلقات تھے قاضی جی سے ہی ہی ہی۔ ان کی باتوں کے دوران دادی اس کی قمیض کو گھور گھور کر دیکھتی اور موہوم آئیں بھرتی۔ ایلی بھی ان کی قمیض کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کسی کے آنے پر وہ قمیض ضرور پہنا کرتے تھے۔ مگر جلد ہی مطمئن ہو کر اتار بھی دیتے تھے اور پھر اپنے کام میں لگ جایا کرتے تھے۔ لیکن نہ جانے سارہ صبورہ کے آنے پر انہوں نے قمیض اتاری کیوں نہ تھی۔ پھر کچھ دیر کے بعد وہ چلم اٹھائے خود باہر چوہنے کی طرف آرہے تھے۔ وہ تو چلم بھرنے کیلئے ایلی یا کسی اور کو آواز دیا کرتے تھے۔

”ہی ہی ہی۔“ وہ ہٹنے لگے اور با آواز بلن بولے ”اپنے قاضی اظہر کی بیٹیاں ہیں۔ ایک مرتبہ ہم قاضی صاحب سے ملنے گئے۔ ہی ہی ہی ہی۔“ یہ کہتے ہوئے وہ اٹھ کھڑے ہوئے اور اس کمرے کی طرف چل دیئے جس میں اڑکیاں بیٹھی تھیں۔ قاضی صاحب بڑے تپاک سے ملتے۔ ”وہ بزر کھڑکیوں والا مکان تھا نہ پھانک محلے میں۔“ وہ اندر گھس گئے۔ ”اچھا تو تم بڑی اڑکی ہوان کی۔ ہی ہی ہی۔ سارہ ہو۔ تم فرحت کی ہم جماعت ہو۔ اور یہ صبورہ ہے۔ ہی ہی ہی۔“

باہر چو لہے کے پاس واڈی اماں چمٹے سے زمین کرید رہی تھی اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ سیدہ کی آنکھوں میں چمک لہر ارہی تھی اور وہ حسرت ناگ زگاہوں سے تیل کی گڑاہی کو گھورنے کی بجائے غور سے اس بیٹھنے کا باائزہ لے رہی تھی جو چو لہے کے ساتھ چمٹا ہوا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ کان سے دو پتھر کا نے جا رہی تھی۔

”ہی ہی ہی۔ آؤ نا۔ ادھر۔ اس طرف۔ اس کمرے میں، اچھا تو قاضی صاحب کا
اب کیا حال ہے؟ ایلی بھتی بھاگ کر جا اور لے آ کچھ بوتلیں اور کچھ
ادھر آؤ نا سارہ۔ انہیں لے آؤ نا ایلی کی ماں
ہی ہی ہی۔“

بہت ہی بھلے آدمی تھے ان کے ابا۔ ہمارے دوست تھے۔ ہی ہی ہی۔“
ہاجرہ مسکرا رہی تھی۔ مگر اس کی مسکراہٹ میں بلا کا اضطراب تھا اور فرحت کے
ما تھے پر بل پڑ رہے تھے۔ علی احمد کی مسلسل ہی ہی کی آواز آ رہی تھی۔ دادی کا ہاتھ
کانے پر لگا۔ اور سیدہ کا کان با لگ نگا ہو چکا تھا۔

شام کو ارجمند نے آواز ”آیا“ میلی چلا�ا۔ لیکن نہ جانے کیوں ارجمند ایلی کا انتظار کرنے کے بجائے چپ چاپ اوپر آگیا۔ حالانکہ وہ عام طور پر ایلی کے گھرانے سے گرین کیا کرتا تھا ”دادی اماں سلام ایلی گھر ہے کیا؟“ اس نے چور چوری والان کی طرف دیکھا جہاں سارہ اور صبورہ بیٹھی تھیں اور پھر

دروازے سے باہر اس مقام پر کھڑا ہو گیا، جہاں والان میں بیٹھی ہوئی لڑکیاں اسے اچھی طرح دیکھنے تھیں۔ اس نے جیب سے ریشمیں رومال نکالا اور اسے گردن پر پھر نے لگا پھر وہ ایک انداز سے کھرا ہو گیا۔ ”بیٹھ جا۔“ دادی اماں بولی ”خوبیں دادی اماں میں ٹھیک ہوں۔“ ارجمند نے چوری کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا اور پھر آواز نکالے بغیر کوئی شعر نگلنا نے لگا۔ ایلی سامنے چیران کھرا تھا۔ کیونکہ ارجمند جان بو جھ کراس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ کچھ دریق ایلی دیکھتا رہا پھر چکے سے اس کے قریب آ کھڑا ہوا اسے یوں قریب دیکھ کر ارجمند بولا۔ ”ایلی وہ کتاب تمہارے پاس پیٹے ہے؟“

”بھی وہی۔“ وہ بہ آواز بلند بولا۔ ”جو ماہر صاحب کل پڑھا رہے تھے کیا نام ہے اس کا۔“ وہ پھر دبی دبی آواز میں ایلی سے کہنے لگا۔ واہ وا کیا چیزیں ہیں۔ کیا کھوری ڈکوری ہیں۔ ہاں بھی تو وہ کتاب ہے جس میں سے آج سوال کرنے ہیں۔“ وہ پھر دادی اماں کو سنانے کے لئے چلا یا۔ ”بڑا والا نہیں چھوٹا والا ایڈیشن وہ گلابی گلابی سی۔“ اس نے اندر والان کی طرف اشارہ کیا۔ ”کیا چیز ہے واہ ایلی کی کچھ سمجھے میں نہ آ رہا تھا۔“ دادی اماں ارجمند کو گھور رہی تھی۔ اس کے ریشمیں رومال کو گھور رہی تھی۔ وقعاً اس نے دادی اماں کی کڑی نگاہوں کو محسوس کیا۔ ”اچھا وہ بولا۔“ ذرا ہمارے گھر آؤ نا ایلی۔ وہ چھوٹی گلابی۔ چھوٹا والا ایڈیشن۔ آؤ گے نا۔“ اس نے اندر والان کی طرف دیکھا۔ ”میں انتظار کروں گا۔ ہائے کیا چیز ہے۔“ اور وہ چلا گیا۔

ارجمند کے جانے کے بعد رفیق آگیا اس کی بگاہیں یوں مطمئن تھیں، جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ ”پھوپھی کہاں ہے؟“ اس نے زیر لب کہا ”شاید ادھر ہو۔“ وہ اپنے آپ ہی بولا اور والائیں داخ ہو گیا۔ پھر وہ ٹھٹھکا ”اوہ۔ مجھے تو پتہ ہی نہ تھا۔“ اس نے گویا

دیوار سے مخاطب ہو کر مغضزرت کی اور واپس جانے لگا۔ ”رفیق ہے۔“ ہاجرہ نے آواز دی۔ وہ رک گیا۔ ایک سرسری مگر بھلی نظر سارہ اور صبورہ پڑا۔ ایک ملی سی آہ بھری۔ ”وہ کہا تھا ناپھوپھی جی نے سودالانا ہے تو میں آگیا۔ خیر خیر!“ اس کی آنکھوں میں گلابی چینٹے اثر ہے تھے۔

ہی ہی ہی۔ اندر علی احمد نس رہے تھے۔ ”وہ بات بتانا تو میں بھول ہی گیا جب۔“ کہتے ہوئے چلم اٹھائے چلے آئے اور چوہبہ کے قریب جانے کی بجائے سید ہے والا ان میں کھس کے۔ ”ہی ہی ہی جب تم سب قاضی صاحب کے مکان پر گئے تھے۔ ہی ہی ادھر تو ناسارہ صبورہ تھیں بات سنائیں۔ اس کمرے میں آدم تم شرماتی کیوں ہو۔ یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ ہی ہی ہی۔ قاضی صاحب کے گھر کو تو ہم اپنا ہی گھر سمجھا کرتے تھے۔ تم کیوں شرماتی ہو۔ آ جاؤ آ جاؤ۔“

وہ کھڑے نہے جا رہے تھے دادی اماں کا ہاتھ کا نپ رہا تھا۔ سیدہ کا ڈوپٹہ کان سے گرتا جا رہا تھا۔

”بھئی فرحت یہ تمہارے کہنے کے بغیر نہیں آ سکیں گی۔ ٹھیک تو ہے۔ بھئی یہ آ داب طور طریقہ کیسے چھوڑیں۔ جب تک میزبان خود نہ کہے کیسے آ سکیں اور بھئی فرحت تو ان کی میزبان ٹھہری۔ کیوں فرحت یہی بات ہے نا ہی ہی۔ آخر بڑے گھرانے کی لڑکیاں ہیں۔ بہت بڑا گھر انہیں ہے ان کا، کون نہیں جانتا ان کے گھرانے کو دورا ہے میں۔ اچھا تو فرحت تم انہیں ساتھ لے آؤ۔ ادھر ہی ہی۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔

رات پڑ چکی تھی۔ لیکن ہاجرہ ابھی باور پی خانے میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی کہ علی احمد کھانا کھائیں تو وہ فارغ ہو۔ صبورہ فرحت کے ساتھ گپیں مارنے میں مشغول تھی۔ دادی اماں جائے نماز پڑھی تھی۔ سیدہ بستر میں لیٹی ہوئی تھی۔ ایلی دادی اماں کی

چارپائی پر اوندھا پڑا نہ جانے کی اسوق رہا تھا۔ علی احمد پانے کمرے میں سارہ کو وہ قصہ سنارہت تھے جب وہ قاضی صاحب سے پہلی مرتبہ ملے تھے۔

”ہی ہی ہی اور قاضی صاحب نت سمجھا۔ یہاں قریب ہو کر سنو۔ انہوں نے سمجھا کہ ہی ہی ہی اندھیرے میں نہ جانے کون ہے۔ ہی ہی ہی۔ ہاتھ چلانے شروع کر دیئے یوں۔ یوں ہی ہی ہی۔“ ہلکی سی باریک بُنی کی آواز سنائی دی۔ ”ہی ہی ہی۔“ علی احمد بے تھاشاہیے چلے جا رہے تھے۔ ان کے کمرے میں نہ جانے کیا غمہ مذہبی واقعی قاضی صاحب پکڑو و حکم کر رہے ہوں۔ بُنی کی ہلکی آواز آئی پھر ہورہا تھا۔ جیسے واقعی قاضی صاحب پکڑو و حکم کر رہے ہوں۔ پچھہ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر بند ہو گئی۔ ”ہی ہی ہی۔“ بھاری آواز بھی بند ہو گئی۔ پچھہ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر دنلاہائے اللہ کی آواز آئی اور پھر علی احمد کے کمرے پر موت کی ہی خاموشی چھا گئی۔

جائے نماز پر بیٹھے ہوئے دعا مانگتے مانگتے والدگی اماں ہاتھ لرزے جیسے دعطا اے یعنی کا عارضہ ہو گیا ہو پھر وہ وصہپ سے سجدے میں گر گئی۔ سیدہ نے آہ بھر کر رضاۓ منہ پر لے لی۔ مشین پر کیڑا سیتے سیتے ہاجرہ کا ہاتھ کانپا اور دستہ مشین کی چڑھی سے باہر نکل آیا اور ہاجرہ بھٹ پھٹی نگاہوں سے صبورہ اور فرحت کی طرف دیکھے گئی۔ فرحت نے ماں کی طرف دیکھا اس کارنگ زرد پڑ گیا۔ لیکن صبورہ اسی طرح خوشی سے چلاتی رہی بُنی رہی پھر دعطا اس نے محسوس کیا۔ جیسے کچھ ہو گیا ہو اور وہ خاموش ہو گئی۔

ایلی نے سراٹھیا چاروں طرف گھبرا کر دیکھا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ جیسے بہت کچھ ہو گیا تھا۔ اس کے دل پر ایک بو جھ سا پڑ گیا۔

کچھ بھی تو نہیں

چواؤں۔ ٹھک علی احمد کے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ تمام گھر پر بھی انک سکوت طاری تھا۔ موت کا سکوت، موت! ایلی کانہ گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے صفیہ آگئی۔ جیسے وہ اس روز چارپائی پر پڑی دم توڑ رہی تھی۔ ایلی نے محسوس کیا کہ علی احمد کے ساتھ سارہ کمرے میں اسی طرح سر پٹک رہی تھی۔ ادھر سے ادھر۔ ادھر سے ادھر۔

آنکھیں پتھرائے جا رہی تھیں۔ ڈر کی وجہ سے اس کی چیخ نکل گئی۔ دادی اماں اچک کر اس کے پاس آگئی۔ ”کیا ہے دادی اماں؟“ وہ زیر لب گنگنا یا۔ ”کچھ نہیں ایسا۔“ دادی اماں نے کہا ”کچھ بھی تو نہیں۔ سو جاتو۔“ اور وہ اسے کانپتے ہوئے ہاتھ سے تحملنے لگی۔

اگلے روز جب ایسا بیدار ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ گھر پر وہی بھیا نک خاموشی چھائی ہوئی ہے۔ اس صبح وہ تمام دنیا کے خلاف غصہ محسوس کر رہا تھا وہ کمرہ غلاظت سے بھرا تھا۔ وہ گھروہ محلہ وہ شہر سب گندگی سے بھرے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ محلے والے بھی اندر ہے تھے۔ اندر ہے اور اپا بھی۔ ایسا کا جی چاہتا تھا کہ وہ گھروہ محلہ وہ شہر چھوڑ کر کہیں چلا جائے جہاں نہایت نہ ہو جہاں گندگی نہ ہو جہاں بھیا نک خاموشی نہ چھائی ہو۔ اس کی نگاہ دادی اماں پر جا پڑی جو چہ چاپ گھنٹوں میں سر دیئے بیٹھی تھی۔

اس نے پہلی مرتبہ دادی اماں پر غصہ محسوس کیا۔ کیا وہ گھنٹوں میں سرد ہے اور سجدے کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ ویسے محلے کے لڑکوں کے خلاف تو اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ جب صدر اس کے مکان کی دیوار پر پٹاخہ چلاتا تو اس وقت وہ کیوں چینچتی تھی۔ اے ہے مکان کی دیواریں ہل گئی ہیں۔“ اب کیا مکان کی دیواریں نہیں ہل رہی تھیں۔ پھر وہ یوں چپ کیوں بیٹھی تھی اور فرحت کے پاس بیٹھی ہوئی وہ بھیگلی بلی سارہ جھکی جھکی نگاہوں سے گھروالوں کو ٹول رہی تھی۔ اور صبورہ یوں چپ چاپ بیٹھی جیسے کچھ کھو گیا ہو۔ ایسا نے پہلی مرتبہ سارہ کی طرف نگاہ بھر کر دیکھا۔ بھیگلی بلی کیسی چور نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اسے واضح طور پر معلوم نہ تھا کہ وہ اسے بری کیوں لگ رہی ہے۔ لیکن وہ اسے بری لگ رہی تھی۔

اہر سے ابا کے حقے کی گڑگڑاہٹ سن کر اس نے منہ بنایا۔ بڑے علی احمد بنے پھرتے ہیں۔ ہی ہی ہی۔ فضول دانت لکاتے رہنا۔ باہر دادی اماں بیٹھی بار بار

والان کی طرف دیکھ کر آئیں بھر رہی تھی۔ اور سیدہ چپ چاپ بیٹھی آلوجھیل رہی تھی۔ ہاجرہ تو خیر بر تین وھونے کے سوا کچھ کر رہی نہ سکتی تھی۔ ایسا دل ہی دل میں بل کھاتا رہا اگر چہ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیوں بل کھارہا ہے۔

پھر گھر میں یہ صدور ہو گیا علیٰ احمد سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھے رہتے۔ اگر چہ دن میں چار ایک مرتبہ خود حقہ کی چلم اٹھا کر والان کی طرف چلتے آتے حالانکہ انہوں نے کبھی خود چلم نہ پھری تھی اور پھر ہاجرہ کے کمرے میں جھانتے۔ ”ہی ہی کیا ہو رہا ہے۔ بھائی۔“

سارہ صبورہ ”پھیں چل رہی ہیں۔ خوب خوب ہم صبورہ کو پھیں بڑی پسند ہیں۔“
دن میں دو ایک بار جنمہ آ جاتا۔ ایں ایسا بھائی وہ سوال چھٹی مشق کا پندرہواں سوال وہ کیسے ہوگا۔ انہن سے تو نہیں ہوتا۔ بھائی واہ آج تو صندلی پیرا ہن زیب تن ہے۔ یہ آج معلوم ہوا کہ چاہ غب غب صندلی پیرا ہن پر کیا بہار دیتا ہے۔“

رفیق آ کر پوچھتا ”پھوپھی آج مچھلی بہت سستی بک رہی ہے، کیا خریدو گی؟“ اور
چھپ چھپ کر اندر جھانتا آئی بھرتا۔

رات پڑتی کو علیٰ احمد آتے۔ ”ہی ہی صبورہ سو گئی کیا ابھی نہیں سوئی
یہی عمر تو ہے پھیں ہانکنے کی ہی ہی اور سارہ۔ سارہ تو دریتک
جائیں کی عادی ہے۔ کیوں سارا۔ اچھا بھائی۔“

یہ کہہ کر وہ باہر نکل آتے۔ اور پھر والان سے آواز دیتے ”فرحت کی ماں صبورہ
سو جائے تو مجھے آج کا حساب لکھوادینا۔ اور۔ اور۔“ اور وہ عجیب انداز سے ہٹنے
لگتے۔

اس پر ہاجرہ کہتی ”ہائے لڑ کیواتی دیر ہو گئی ہے اب سو جاؤ۔“ اور فرحت فوراً لیٹ کر
کہتی۔ ”بھائی ہم تو اب سوتے ہیں۔ نیند آگئی۔ آؤ صبورہ تم بھی جاؤ۔“ اور زبردستی
صبورہ کو لٹایتی اور پھر آنکھیں بند کر کے یوں پڑ جاتی جیسے نہ جانے کب کی سوئی ہوئی

سارة چپ چاپ اپنی چارپائی پر چلی جاتی مگر وہ لیتھی نہ تھی۔ ایک طرف چپ چاپ بیٹھ رہتی۔ اس پر ہاجرہ صبورہ کھسوں کرتی۔ جیسے کمرے میں گھٹن پھیل رہی ہو اور وہ کھسیانی نہیں کر کوئی بات چھیرنے کی کوشش کرتی مگر سارہ پر چپ چاپ بیٹھی رہتی۔

پھر جب صبورہ نو جاتی تو علی احمد کی آواز آتی ”فرحت کی ماں فرحت کی ماں آج کا حساب تو لکھوادوآ کر صبورہ سوگی ہے نا۔“

علی احمد کی آواز کن لڑاؤی اماں کا در بلنے لئتا اور وہ رکوع کے بغیر ہی سجدے میں گر جاتی۔ ادھر سارہ بخوبیوں سے باجرہ کی طرف دیکھتی۔ باجرہ اٹھ بیٹھتی اور سارہ چپ چاپ اس کے پیچے چل پڑتی۔ جب وہ صحن سے گزرتیں تو سیدہ اپنا منہ رضائی میں لپیٹ لیتی۔ ایلی گھبرا کر اٹھ بیٹھتا لیکن واوی اماں نماز پڑھتے ہوئے با تھہڑا کرا سے تھکنے لگتی۔ پھر کچھ دیر کیت بعد ہاجرہ ان کے کمرے میں جھائختی۔ ”سو گیا؟“ ایلی کو جائے دیکھ کر گھبرا کر بات بدلتی اور ہاجرہ کے جانے کے بعد گھر پر ہنگامہ خیز سکوت چھا جاتا۔

پھر ایک رات صبورہ اور فرحت حسب معمول باتیں کرتے کرتے یہ گئی تھیں اور سارہ دو پڑھے اوڑھے یوں صبورہ کی چارپائی کے کونپر بیٹھی تھی۔ جیسے اسے اہمی اٹھ کر کہیں جانا ہو اور ہاجرہ منتظر کھڑی تھی کہ کب آواز پڑے اور وہ سارہ کو راستہ دکھا کر اپنے فرض سے فارغ ہو جائے کہ دعطا علی احمد کی آواز سنائی دی۔ جیسے وہ بالکل یہدی ہوئی ہو۔ ”صبورہ جاگ رہی ہے۔“ انہوں نے سرال میں کہا۔

صبورہ! ہاجرہ کے ہونٹ ہلے۔ اس نے حیرت سے چھوٹی سی پچھلی طرف دیکھا۔ جس نے ابھی عنفو ان شباب میں قدم رکھا ہی تھا۔

صبورہ کی آنکھیں یوں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جیسے دعطا بینائی سے محروم ہو گئی ہوں۔

داوی اماں نے صبورہ کا نام سناتو اس نے پہلی ہی رکعت میں سلام پھیر دیا۔

”کس نے بلایا ہے مجھے؟“ صبورہ اٹھ بیٹھی ”مجھے بلایا ہے مجھے؟ پچھا نے بلایا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرائی ”مجھے بلایا ہے۔ مجھے۔“ اور وہ شور مشاتی چلاتی ہوئی بوتی ”آ تو رہی ہوئی۔“ اور پھر آپ ہی آپ علی احمد کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ یہ دیکھ کر سارہ بیٹھی بیٹھی چار پانی پڑھیر ہو گئی۔ جیسے کوئی گھڑی گر کر اونٹھی ہو گئی ہوا اور فرحت نہ منہ موز کر کر اور پر کمبل لے لیا اور باجرہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

چراوں ٹھک دروازہ بند ہو گیا۔ گھر پر سنانا چھا گیا۔ ایلی نے دانت پیس کر رضائی پر گونسہ مارا۔ اس روز داؤی ایاں اسے تھپکنا بھول گئی۔ اس نے یہ بھی نہ کہا ”سو جا ایلی۔“ کچھ بھی نہیں کچھ بھی تو نہیں،“

لویٹر

اگلے روز ایلی ارجمند یک گھر بیٹھا تھا اور ارجمند اسے سمجھا رہا تھا ”بڑی والی کو نہیں چھوٹی والی کو۔ وہ جو گلابی گلابی سی ہے۔“ ”اچھا“ ایلی نے سمجھے بغیر کچھ کہنے کی غرض سے کہا۔ ارجمند نے زیر لب کہا ”سب بڑی والیاں بیکار ہوتی ہیں۔ ان سے عشق نہیں ہو سکتا۔ اور اس لئے نہیں لویٹر نہیں لکھا جا سکتا اور اگر لکھو بھی تو بیکار ہے پوچھو کیوں؟ اس لئے کہ ان کا دل دھک دھک نہیں کر سکتا اور دھک دھک نہ کرے تو پھر عشق کیونکر ہو سکتا ہے۔ سمجھے کیا سمجھے۔ تو جان مکن لویٹر چھوٹی والی کو لکھا جائے کہو ری ڈکوری کو۔“

”ہاں۔“ ارجمند چلایا ”بالکل موزوں ہے عمر اس کی لویٹر کے لئے اور اگر ہم نے لویٹرنے لکھا تو وہ خفا ہو جائے گی کہ لویٹر بھی نہ لکھا مجھے بڑے عاشق بنے پھرتے تھے اور اس کا دل دکھے گا۔ سمجھے۔“

لیکن ایلی گھبرا رہا تھا۔ ”اگر اس نے علی احمد سے کہہ دیا تو۔“ ”انہوں“ ارجمند

بولا ”تم انہیں نہیں جانتے۔“ ارجمند اسے سمجھانے لگا۔ ”انکر اینڈ ماباؤں لویٹر کے سہارے جیسی ہیں جب تک لویٹر نہ پڑھ لیں طبیعت کو جیں نہیں پڑتا تازہ موصول نہ ہو تو پرانے پڑھ کر وقت کاٹتی ہیں۔ ان کے ڈنک لویٹر سے بھرے ہوتے ہیں اور چاہے کوئی لکھ دنے انہیں پڑھتی ضرور ہیں اور پھر کیا مجال جو کسی کو بتائیں۔ انہوں بالکل نہیں بتاتیں۔“

”بالکل نہیں۔“

”تو پھر۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”rights reserved © 2002 by the author“ ”پھر کیا۔ پھر پھر اڑا اور ایک لویٹر۔“ ارجمند بولتا ہے۔ ”اچھا،“ ایلی نے ٹھوک نکلنے کا بے کار لوشش کی۔ ”وکس چیز سے لکھیں۔“ میں بتاؤں آنسوؤں سے لکھیں۔“

”مگر آنسو آئیں گے کہاں سے۔ ہم تو بھی ہٹنے کے قائل ہیں۔ روٹے کے نہیں۔ البتہ خون سے لکھنا آسان رہے گا۔“

”وہ کیسے؟“

”پنچھو لیں گے کیا؟“

”تکلیف نہ ہو گی کیا؟“

”واہ اس میں کیا ہے۔ لیکن سوایہ ہے اڑ کیاں خون پسند نہیں کرتیں۔ اس لئے سیاہی سے لکھ دو۔“

”اچھا لیکن لکھیں کیا؟“ ایلی نے پوچھا ”یہ مسئلہ تو چنگی بجانے میں حل ہو جائے گا ہاں۔“ ارجمند نے کہا ”یہ اتنے پریم شاستر پڑے ہیں۔ ان میں سے چن لو۔“ ارجمند نے کشمیری بازار کی چھپی ہوئی چاروں قسم کتابوں کا ایلی کے سامنے ڈھیر لگا دیا۔

سارا دن وہ خط کا مضمون چھانٹتے رہے۔ آخر شام کے چار بجے قریب خط مکمل ہو

گیا۔ اس میں زیادہ تر شعر لکھے ہوئے تھے۔ ”مائی ڈرری لکھوں، میری جان لکھوں یا
در بالکھ۔ اے جان من میں تم کو القاب کیا لکھوں۔“ یہ شعر تو القاب کی حیثیت
رکھتا تھا۔ نفس مضمون کا شعر یہ تھا ”اس حسن ترے کی بیوی نے مرے جنگل ہارٹ کو
توڑ دیا۔ جب سے تم پر ہوا ہوں شیدانا بک سلپنگ چھوڑ دیا۔“ اس شعر کے چنان
میں بڑی لے دے ہوئی تھی مگر ارجمند نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ اگر یہ شعر نہ لکھا
گیا تو لویٹرا دھورا رہ جائے گا۔ کیونکہ سکول کی لڑکیاں صرف انہی شعروں کو پسند کرتی
ہیں۔ جن میں انگریزی کی چاٹنی ہو ورنہ اپنا لویٹر کسی سہیلی کو بھی نہیں دکھا سکتیں کہ
وہ یہ نہ سمجھ لے کہ اسے کسی گزارنے لویٹر لکھا ہے۔

ارجمند کی بات معقول تھی اور زندگی ہوتی تو بھی ایسا لکھنے پر بجور تھا کیونکہ اسے تو لو
یٹر کے متعلق علم ہی نہ تھا۔ وہ نہ جانتا تھا کہ لویٹر لکھنے سے ہوا کیا۔ شام تک لویٹر تو
تمکمل ہو گیا لیکن اسے صبورہ تک پہنچانا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ ایسا کا دل دھڑک رہا
تھا۔ اس کی قمیض کی وہ جیب جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جس میں اس نے لویٹر
اس کی جیب میں ڈال دینا اور جیب میں نہ ڈال سکو تو اسے دوسرے دکھانا۔ دیکھ کر وہ
بے قرار ہو جائے گی اور خود ہی منت کر کے مانگ لے گی۔

دوسری تجویز تو ایسا کے لئے قطعی طور پر ناقابل قبول تھی دکھانا بڑی جرأت کا کام
تھا۔ البتہ چوری چوری اس کی جیب میں رکھنا شاید ممکن ہو۔ لیکن وقت یہ تھی کہ اس کی
قمیض میں جیب نہ تھی۔ عجیب قمیض پہنچتی تھی۔ وہ اس نے پہلی مرتبی دیکھا کہ اس کی
قمیض شروع سے لے کر آخر تک انوکھی تھی۔ جا بجا چنٹیں پڑی ہوئی تھیں کہیں کھلی
کہیں تنگ کہیں کچھ کہیں کچھ ایسی قمیض تو محلہ بھر میں کسی کی نہ تھی۔

پھر جب دونوں بہنیں بیٹھی با تینیں کر رہی تھیں تو دفعتاً اسے لویٹر کا خیال آیا اور
پسینہ آگیا۔ دل دھڑکنے لگا لیکن ہمت کر کے اس نے وہ رقصہ اس کے جو تے
میں ڈال دیا۔ جلدی میں اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ جوتا کس کا تھا۔ سارہ یا صبورا

اگلے دن وہ علی احمد کے روپ و صریح کئے کھڑا تھا۔ ”مول“ وہ کہہ رہے تھے ”جس بنا دے۔“ اور سارہ ان کے قریب کھڑی مسکرا رہی تھی ”بنا وہ گرج رہے تھے“ ہوں تو تمہیں نے شرات کی ہے شرم نہیں آتی۔“

”شرم نہیں آتی شرم نہیں آتی۔“ شاروں طرف سے آوازیں آ رہی تھیں۔ غصے بھری آوازیں اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ دیوانہ والر چلانے لگے۔ شرم نہیں آتی اور علی احمد کے سامنے تن کر کھڑا ہو جائے شرم نہیں آتی۔ ہی ہی ہی اور باہر کل جائے اس مکان سے دور پاں شہر سے دور۔

”دفع ہو جاؤ ہماری نظر میں سے دور ہو جاؤ۔“ علی احمد گرجے اور ایلی چپ چاپ آ کر چار پائی پر پڑ گیا۔

تمام گھر میں چاروں طرف سورج پا ہوا تھا۔
ہی ہی ہی۔ شرم نہیں آتی۔

قاضی صاحب تو سمجھ لو ہمارے بھائی تھے۔ ذرا قریب ہو جاؤ نا۔ شرم نہیں آتی۔
شرم نہیں آتی۔ شرم نہیں آتی۔ محلے کے کوئے چلا رہے تھے۔
چہاؤں، ٹھک عیل احمد کا دروازہ بند ہوتے ہوئے کراہ رہا تھا۔ شرم نہیں آتی۔
غصے میں بھنا کر ایلی نے سراٹھایا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ منہ سو جھا ہوا تھا۔ کپٹیاں تھرک رہی تھیں۔ ”شرم نہیں آتی“ وہ بے آواز بلند چلایا لیکن گھیں گھیں کے علاوہ اس کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔ بے بسی اور لا چاری کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے ٹپٹپ آنسو گرنے لگے۔

چھٹی ختم ہونے پر علی احمد کا تباولہ بام آباد ہو گیا، لیکن علی احمد تن تھا بام آباد جانے کے لئے تیار نہ تھے۔

علی احمد تھا انی سے ڈرتے تھے شاید وہ اپنے آپ سے خائن تھے وہ کمرے میں اکیلے سونہ سکتے تھے۔ اگر سوتے میں ان کے کمرے سے لوگ چپ چاپ نکل آتے تو جو نبی آخری آدنی باہر نکلتا، وہ گھبرا کر جاگ آختے۔ اسی وجہ سے ان کا کسی کمرے یا مکان میں اکیلے رہنا ممکن نہ تھا۔ تھا ان کے علاوہ خاموشی بھی ان پر گراں گزرتی تھی۔ رات کے وقت اگر ان کی آنکھ کھل جاتی تو وہ اسی چھائی ہوئی خاموشی سے ڈر کر اپنے آپ سے باتیں گرنے لگتے تاکہ اپنی آواز کا سہارا میں یا وہ اپنی بیوی کو پکارتے اور یا حقہ بھر کر اس کی گڑگڑ سے تیکین حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔

الہذا بام آباد تھا جانا کیسے ممکن تھا ایلی کی ماں ان کے ساتھ جانے کی خواہ شمند نہ تھی وہ جانتی تھی کہ اسیا تھے لے جانے سے علی احمد کا مقصد صرف یہی تھا کہ اپنا کمرہ آباد رکھنے کے لئے گھر میں ایک عورت کی موجودگی کا بہانہ قائم ہے۔

اس روز علی احمد دادی اماں کے پاس چپ چاپ بیٹھے تھے۔ دادی اماں کہہ رہی تھیں ”اے ہے لڑکی اگر تو ساتھ پلی جائے تو کم از کم علی احمد کو روٹی کی تکلیف تو نہ ہوگی۔“ اور دروازے سے لگی ہوئی ہاجرہ رو رہی تھی۔ اس کے آنسو شپ شپ گر رہے تھے۔

”اللہ رکھے تیرے بال بچے ہیں تو ہی تو اس گھر کی مالکہ ہے تو ساتھ جائے گی تو ہی گھر بے گا۔“

”نہ میں نہیں بنتی مالکہ اس گھر کی“ ہاجرہ نے پلکی لے کر کہا۔ ”بہت چاکری کر دیکھی ہے۔“

دادی بولی۔ ”آخر تو نہ جائے گی تو گزارہ کیسے ہو گا۔“ ”ہاجرہ نے کہا۔ میرے بغیر انہیں کسی چیز کی کمی ہے کیا۔“

”چل چھوڑا ب“ دادی اماں بولی۔

پھر نہ جانے کیسے چند ہی منوں میں محلہ والیاں آپنچیں جیسے انہوں نے پہلے ہی سے پروگرام بنارکھا ہو۔

”اے ہے کیوں نہ جائے گی تو“ چاپگی حاجباں ہاتھ چلا گرد بولی ”اللہ عمر دراز کرے تیرے بچوں کی تو نہ جائے گی اپنے گھر تو ہو گا کیا۔“

”تو ان آنے جانے والیوں کی پرواکرنی ہے آتی ہیں تو آ جائیں۔ آئیں گی اور چلی جائیں گی۔ ان کا معنی یہ ہے جی کھرو تیراہی ہے نا۔ اپنے لئے نہیں تو ان بچوں کے لئے تجھے ضرور جانا چاہئے۔“

محلے کی بیویوں والیاں ہاجرہ کے گرد چیلوں کی طرح منڈلانے لگیں۔ ان کی جنگیں سن کر ایلی نے محسوس کیا کہ بام پور کا طوفان آیا ہی چاہتا ہے۔ پہلے تو ہاجرہ نے جلی کشی سنانے کی کوشش کی پھر اس نے بچیوں سے احتجاج کیا اور بالآخر خاموش ہو گئی اور اس کی خاموشی پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔

”ہاجرہ جائے گی؛ ہاجرہ جائے گی۔“

”اے ہے کیوں نہ جائے اپنے گھر۔“

”ہی ہی ہی۔“ علی احمد ہٹنے لگے ”تو سامان باندھ دو نا اسکا۔“ اور سامان باندھا جانے لگا اور دو روز میں وہ سب بام آباد جا پہنچے۔

بام آباد ایک نیا شہر تھا۔ لیکن جب ایلی نے اسے دیکھا تو اس میں کوئی ایسا نیا پن دکھائی نہ دیا۔ ایلی کا خیال تھا کہ نیا شہر بھی ویسا ہی ہو گا جیسے نیا گھر ہوتا ہے لیکن اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ نیا شہر نئے گھر سے قطعی طور پر مختلف ہوتا ہے۔

بام آباد ایک ویرانہ تھا، وسیع ویرانہ۔ اس کی سڑکیں بے تحاشہ چوڑی تھیں کہ بڑک

پار کرنا مشکل ہو جاتا۔ پختہ سڑکیں تو درحقیقت بہت چھوٹی تھیں مگر ان کے اردوگرد بہت ساری زمین خالی پڑی ہوئی تھی۔ بازاروں کے دونوں طرف دکانوں کی جگہ جھوپڑیاں بنی تھیں۔ جن میں عجیب سی دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ سڑک کے درمیان دو چوک آتے تھے۔ وہ چوک اتنے وسیع تھے کہ ایک طرف سے دوسری طرف چلتے چلتے ایلی تھک جایا کرتا۔ علی پور کا آصفی محلہ اس ایک چوک میں سماستہ تھا۔ سڑک ختم ہوتے ہی ویرانہ شروع ہو جاتا۔ پھر ہسپتال کی عمارت آتی جس پر ہر وقت موت کا سا سکوت طاری رہتا۔ دائیں طرف بائی سکول کی عمارت تھی۔ ایک بہت بڑی پختہ اور خوبصورت عمارت تھکل و صورت میں وہ انگریزی کے حروائی (E) سے ملتی تھی۔ بڑی عمارے سے ہٹ کر سکونت کی ایک بھی قطار تھی اور اس سے مغرب کی طرف ایک مردغ بلڈنگ تھی جس کے سامنے بہت بڑا پھانک لگا ہوا تھا۔ یہ سول کا بورڈنگ ہاؤس تھا۔

سکول کے اردوگرد وسیع میدان تھے۔ جن میں ریت اڑتی تھی۔ ریت میں کہیں کہیں جھاڑیاں اگر ہوئی تھیں۔ سکول سے پرے یہاں وہاں کھجور کے درخت لگے ہوتے تھے اور سڑک پر اونٹوں کے قالے آتے جاتے رہتے تھے۔

سکول سے بہت دور شہر کے دوسرے سرے پر علی احمد کا مکان ایک گلی میں واقع تھا۔ اس مکان میں چار کمرے تھے۔ ایک بہت بڑا صحن جس میں ایک کونے پر خاردار درخت لگا تھا۔ مکان کے ایک طرف کئی ایک غریب کنبے آباد تھے۔ وہیں ایک کوٹھری میں مالی روپیتھا اور اس کا پیٹا گام رہتے تھے۔ دوسری طرف ایک گھوڑا ڈاکٹر رہتے تھے جن کا رنگ بے حد کا تھا مگر جن کی پیشانی محراب دار تھی۔ ڈاکٹر کا پیٹا فرید بھر پور جوان تھا۔ اس کا منہ کتنا چوڑا تھا اور اس کا جسم کس قدر پھیلا پھیلا سا تھا۔ ڈاکٹر کے گھر میں دو جوان لڑکیاں تھیں۔ زاہد اور عابدہ، جو ہر وقت نمازیں پڑھنے میں لگی رہتی تھیں۔ ان کی آنکھیں موٹی موٹی تھیں۔ لیکن وہ اس قدر

کالی کیوں تھیں۔ ان کی آوازیں یوں سنائی دیتی تھیں جیسے گھنٹیاں نجح رہی ہوں۔ وہ دوں فرحت کی سہیلیاں بن گئیں۔ اس بات پر ایلی کو بڑا غصہ آیا اسے فرحت کی سہیلیوں سے بے حد چڑھ گئی تھی۔ فرحت کی سہیلیوں کا خیال آتے ہی اس کی نگاہوں نے سارہ اور صبورہ آجائیں اور پھر آواز آتی، ”سارہ سو گئی ہے کیا۔“ اور پھر چہاروں ٹھنک دروازہ بند ہو جاتا۔ ”ہونہہ سہیلیاں۔!“ ایلی کے دل میں غصے کی ایک لہر اٹھتی اور وہ ہوا میں ایک گھونسہ چلا دیتا۔

زادہ اور عابدہ نے صحن کی درمیانی دیوار سے ایک اینٹ بٹاں رکھی تھی تاکہ اپس میں با تین کرسکیں اور علی احمد آتے جاتے وہ زدیلہ اور حضرت بھر نگاہوں سے اس سوراخ کی طرف دیکھا کرتے اور باجرہ علی احمد کی نگاہوں کو دیکھ کر اپنا سینہ قھام لیا کرتی ہائے اللہ اب کیا ہو گا اور ایلی محسوس کرتا کہ اب وہ سوراخ بڑا ہو جائے گا۔ بڑھتے بڑھتے دروازہ بن جائے اور پھر ایک دن آواز آئے گی۔ زادہ سو گئی کیا اور عابدہ چپکے سے دروازے سے نکل کر گھر میں آجائے گی اور پھر علی احمد کے کمرے میں گھس جائے گی۔ پھر دروازی بند ہو جائے گا اور پھر۔ پھر۔ لیکن غصے سے اس کامنہ اس قدر رسرخ ہو جاتا کہ ”پھر،“ متعلق اسے کوئی دیکھی شدہ تھی۔

رفیقان

بام آباد میں سب سے پہلی عورت جوان کے گھر آئی رفیقان تھی۔ ”لبی کوئی کم ہو وے تاں ڈسوٹا،“ اس کے انداز میں بے بسی جھلک نمایاں تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں ایلی نے محسوس کیا کہ اس کی جھلک جھلک آنکھیں نہ دیکھنے والی نظر آئنے کے باوجود دیکھتی تھیں۔

ہاجرہ پہلے ہی روز رفیقان کی دکھ بھری کہانی سن رہی تھی اور اس کا پلو بھیگا ہوا تھا۔ ایلی نے ایک نظر دونوں کو دیکھا اور پھر غصے سے بے تاب ہو کر باہر چلا گیا۔

رفیقان روزان کے یہاں آنے لگی۔ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بیٹا گاماں بھی ہوتا

تحاوہ آکر گھر کے کام کا ج میں ہاجرہ کا ہاتھ بٹاتی اور اس روزن میں علی احمد خلاف
معمول خود چشم اٹھانے باور پی خانے میں آ جایا کرتے۔

”اوہ۔ رفیقاب ہے۔ کیا حال ہے رفیقاں اپنی تو ہے۔ بڑی دیر کے بعد دیکھا
ہے تجھے۔“ اور رفیقا مسکراہٹ بھینجنے کی کوشش کرتی اور نظریں جھکائیتی اور علی احمد
اپنے آپ باتیں کرتے تھک جاتے اور پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے اور
وہاں پہنچ کر آواز دیتے ”رفیقاں ذرا آنا تو۔“ اس پر ہاجرہ کی تصوری چڑھ جاتی اور
رفیقاں مسکرا کر سر جھکائیتی جیسے وہ سب بھتی ہو اور چہ چاہئی کام کئے جاتی۔

لیکن ایلی کو محسوس ہوتا جیسے اس کی خاموشی میں ہاں کی جھلک ہو جیسے اس کا جی
چاہتا ہو کہ انہوں کے مرے میں چلی جائے اور پوچھا آپ نے بلا یا ہے جی
لیکن وہ بیٹھے رہنے پر مجبور تھی۔ لیلی کی کہے گئی اور لیلی بی بات بات پر کچھ نہ کچھ کہا
کرتی تھی آواز پڑنے پر وہ زیر اولب کہتی ”اونھوں۔ ان تکوں میں تیل نہیں رفیقاں
ایسی نہیں۔ سب عورتیں ایک سی نہیں ہوتیں کہ بالوے کے منتظر ہوں۔“ یہ سن کر
رفیقاں مسکرائے جاتی اور ایلی مہم طور پر محسوس کرتا۔ جیسے رفیقاں کا جی کچھ اور چاہتا
ہے اور وہ کچھ اور کر رہی اور ایلی کی نگاہ میں رفیقاں کی مسکراہٹ دودھاری چھری کی
طرح محسوس ہوتی تھی اور وہ رفیقاں سے نفرت کرتا اور یہ نفرت روز بروز شدید تر
ہوتی جاتی تھی۔

لیکن ہاجرہ رفیقاں کے گن گاتی تھی۔ بات بات پر رفیقاں کی تعریف رفیقاں کی
شرافت اور نیکی کی گھر میں وہوم پچی ہوئی تھی۔ شاید اسی وہوم کی وجہ سے رفیقاں قطعی
طور پر مجبور ہو گئی تھی کہ علی احمد کی آواز سننے کے باوجود چپ چاپ بیٹھی رہے۔ اس
کے باوجود جب وہ علی احمد کے کمرے کے دروازے کے قریب سے گزرتی تو اس کی
گردان تن جاتی۔ گھر ایوں کھلتا اور بند ہوتا کہ عجیب سے دائرے بننے چلے جاتے
اور ایلی محسوس کرتا جیسے اس کا جی چاہتا ہو کہ رک جانے اور چوری چوری مسکرانے کی

بجائے قہقهہ مار کر نہیں دے سکیوں بلا یا ہے مجھے۔ کس نے بلا یا ہے مجھے، مگر وہ چلے جاتی۔ ایلی سمجھتا تھا کہ ہاجرہ کی توقعات نے اس کا وہاں رکنا ممکن کر دیا اور ہاجرہ کے ان محبت بھرے جذبات سے جو اس نے رویتیاں سے وابستہ کر رکھے تھے۔ صفیہ کی بو آئی تھی اور ایلی کو محسوس ہوتا تھا جیسے رویتیاں صفیہ کی جائشیں ہو۔ ایلی کو اس بات پر اور بھی غصہ آتا تھا۔

علی احمد کا گھر ایک عجیب گھر تھا۔ اس میں دو طبقیں بر سر پیکار تھیں۔ علی احمد اور ہاجرہ ہر نو وار دو یا تر کرونوں طبقیں اسے اپنی اپنی طرف پھیپھیتیں۔ علی احمد کے دروازے سے قہقہوں کی آواز سنائی دیتی اور باور پیچی خانے سے دبی دبی آہوں کی۔ وہ کمرہ اور باور پیچی خانہ دو فلوں ہی مظلوم تھے۔ کرہ ہی ہی کرنے پر مجبور تھا اور باور پیچی خانہ آہیں بھر نے پر فطرت ان دو فلوں کی مجبوریوں پر مسکراتی تھی۔ جیسے وہ ان دو فلوں کے راز سے واقف ہو اور ان دونوں کی کشمکش سے دو را ایلی اور فرحت ایک دیوانے میں اکیلے زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ تن تھا۔

ہر نو وار دو کے پاؤں کے آہٹ سن کر دونوں بھائی بہنوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔ اب کیا ہو گا۔ وہ اشتیاق بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگتے۔ نو وار دو کمرے اور باور پیچی خانے کے درمیان لٹک جاتی اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ بالآخر یا تو وہ باور پیچی خانے میں جا پہنچی اور یا علی احمد کے کمرے میں رک جاتی اور پھر مکان سے یا تو قہقہوں کی گونج سنائی دیتی اور یا آہوں کی۔ ہر سوت میں مکان پر ایک اداسی چھا جاتی۔ جس میں دبی دبی چینخوں کی گھٹی گھٹی آوازی سنائیں دیتیں اور ایلی ڈر کر چلاتا آپا اداسی کیوں ہے۔ اور فرحت آہ بھر کر کہتی۔ اب تو سونے گا بھی کہ نہیں۔“

صفیہ کی موت کے بعد بھی گھر میں ہاجرہ کی حیثیت ایک نوکرانی سی تھی۔ وہ دن بھر باور پیچی خانے میں بر تن مانگھتی۔ آہیں بھرتی اور آنے جانے والیوں کے پاس بیٹھ کر

آنسو بھاتی رہتی ”میلی کی ماں“ کمرے سے آواز آتی۔ وہ گھبرا کر اٹھ چکتی ”جی۔ آئی۔“ اور پھر دروازے کے باہر چوکھت سے لگ کر پوچھتی۔ ”جی کیا ہے؟“ جیسے کوئی فقیر بھیک مانگنے کے لئے کھڑا ہو۔ باجرہ فطر اور ارزی طور پر بھکارن تھی۔ ڈر خوف ہراس اور احساس مکتری اس کی گھٹ میں پڑے تھے جو اس نے وراثت میں ایلی کو بخش دیتے تھے۔

بند کمرا

پھر علی احمد کے دفتر میں گلر کوں کی بھرتی کے لئے امتحانات شروع ہو گئے اور علی احمد کے گھر میں سفارشات کا سلسلہ جاری ہو گیا۔ وہ پہلا موقعہ تھا جب کہ ایلی کو احساس ہوا کہ امتحانات اس قسم کے ہتھیار بھی پیدا کر سکتے ہیں۔

دیواری میں غریب سامنکوں کی نتیجیں سنائی دیتیں اور پھر کھجوروں سے بھری ہوئی ٹوکری اندر آ جاتی اور پھر علی احمد کو خود باہر جا کر ٹوکری بھینٹنے والے کو ڈالنا پڑتا۔ پھر مزید منتوں کی آوازیں بلند ہوتیں اور پھر ٹوکری دوبارہ گھر میں آ پہنچتی۔

ان دنوں سفارشوں کا تانتا بندھا تھا۔ شاید اس لئے کہ با م پور غریبوں کا شہر تھا۔ یا شاید اس لئے کہ علی احمد کے ٹین کے سپاہی کے متعلق لوگ جان چکے تھے۔

علی احمد اپنے کمرے سے باہر سامنکوں کی طرف دیکھتے اور پھر یوں کام میں لگ جاتے۔ جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ ادھر ہاجرہ ان سامنکوں کو منہ نہ لگاتی اور با کئے بغیر اپنے کام میں مشغول رہتی۔ پھر ایلی چور چوری جھانکتا اس کی توجہ لوگوں کی نسبت اس تو کری پر پڑتی۔ جوان کے ساتھ ہوتی۔ علی احمد کی توجہ ٹوکری کے بجائے اس شخص پر پڑتی جو سفارش کے لئے آتا تھا۔ چار ایک بار دیکھنے اور جانچنے کے بعد وہ باہر نکلتے اور غصے میں چلاتے ”ہاں بھی کیا کام ہے۔ میں کچھ نہیں کر سکتا۔ میں قطعی طور پر مجبور ہوں۔“ یہ کہہ کروہ اندر چلے جاتے اور ارزسرنو کام میں مشغول ہو جاتے۔

اکثر سفارش برآہ راست علی احمد کے کمرے میں جا پہنچنا اور ابتدائی جھاڑ جھپڑا

کے بعد ہی ہی ان کا تھہہ گو نجات اور ایلی کو معلوم ہو جاتا کہ ٹین کا سپاہی بیدا ہو چکا ہے اور ابھی وہ رزم گاہ میں اتر آئے گا اور پھر گھر پر موت کا سنا نا چھا جائے گا اور اس سنائے میں نگین گردبی دبی ہنسی کی آواز بھرے گی۔ پھر وہاں سب ٹھیک ہو جائے گا اور نتائج خوبیوں کو ہوں گے۔ جیسے دکھی شہزادی کی کہانی میں مشکلات لڑائیوں اور امتحانات کے بعد سب ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اور اس کے بعد سب ہمیشہ خوش و ختم رہتے رہتے ہیں۔

اس سے پہلے ایلی کو ہم سا حساس تھا کہ سب قصور علی احمد کا ہے اور وہ سوچا کرتا نہ جانے وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ کیوں دروازہ گھلتا ہے اور پھر بند ہو جاتا ہے۔ کیوں ٹین کا سپاہی نہ نہ کر سکتا ہے اگر اسے خوب معلوم تھا کہ علی احمد کمرے میں جو کچھ ظہور پذیر ہوتا ہے۔ جسے قہروں اور بھیانک سنائے سے تعلق ہے۔ گناہ ہے لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ وہاں ہوتا کیا ہے۔ بلکہ اس کے دل میں دبی دبی آرزو تھی کہ کبھی وہ اتفاقاً وہاں چلا جائے اور اتفاقاً اس کی نظر پڑ جائے اور پھر اسے غصہ آنا شروع ہو جاتا نہ جانے جانے اپنی بے بسی پریا اس عمل پر جو اس کے خیال میں وہاں ظہور پذیر ہوتا تھا۔

اب ایلی کو ہم سا حساس ہونے لگا کہ علی احمد بیچار مجبور تھے ان کی نگاہوں سے ان کی مجبوری واضح ہوتی تھی۔ ان کی ہی ہی ہی میں ان کی مجبوری صاف سنائی دیتی تھی۔ وہ کیون اور کیسے مجبور تھے اسے معلوم نہ ہوا۔ بہر حال وہ مجبور تھے۔ قصور ان کا تھا جو اپنے عزیزوں کو ساتھ لاتی تھیں۔

کورا اور آسا

کور بھی پہلی مرتبہ بھائی کی سفارش کرنے آئی تھی۔ اس کے ساتھ اس کی ماں تھی۔ خود آسا تھا جسے دفتر میں فلر ک بننے کا بے حد شوق تھا تینوں کا قافہ چپ چاپ اندر آ گھا۔ آگے آگے ماں تھی۔ ورمیاں میں کور تھی اور پچھے آسا۔ ماں کے کپڑے میل

سے بھرے ہوئے تھے اس کا جسم لٹا ہوا تھا۔ نگاہ حرص آلوٹھی۔ اسے دیکھ کر انہیں غلاظت کا احساس ہوتا تھا۔ کورسیاہ فام گوشت تھا۔ کورسیا فام گوشت کا ایک گول مٹول لوٹھرا تھی۔ جس پر بھڑ کیلے کپڑے لٹکے ہوئے تھے۔ جو اس لوٹھرے کو اور بھی بد نما بنارہے تھے۔ اس کا قد ٹھنڈنا تھا۔ سرچھوٹا اور گول جس میں چوٹی چھوٹی آنکھیں رینگتیں اور سفید و انت رضامندی کی چمک سے روشن تھے۔

اس ایک اوپرچال مبارکہ کا تھا۔ اس کا چہرہ ڈھنی چمک سے کورا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حماقت کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اس کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کور کے پیچے پیچے چھپے چلانے کی نادی ہے۔

یہ قافلہ چپکے سے مکان میں داخل ہوا اور علی احمد کے متعلق ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے بعد باہر چکن میں اس مقام پر خیمن زدن ہو گیا۔ جہاں سے اندر کام میں منہمک علی احمد پورے طور پر دکھائی دیتے تھے۔ علی احمد نے باہر دیکھا۔ کور کے دانے چمکے۔ انہوں نے جلدی ہی سر جھکا کر لکھنا شروع کر دیا۔ کور اپنے گھنگھرے اور چوٹی کو ٹھیک کر کے علی احمد کی طرف منہ موڑ کر پیٹھنگی۔ بڑھیا نے اس کی طرف پیٹھ کر لی۔ اس اسماں کی طرف اڑتی ہوئی چیلوں کا بغور معاشرے کرنے لگا۔ کور کے دانت پھر چمکے اس نے ایک بھر پورا انگرائی لی۔ علی احمد کے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر جھٹر پر جا گرا۔ ”کون ہے؟“ وہ بولے۔ جواب میں دانت چمکے اور بغیر کسی تمہید کے کوراٹھ کر علی احمد کے کمرے میں جا داخل ہوئی۔ اس پر بوزھیا اس خاردار درخت کو دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ جو چکن میں پھیلا ہوا تھا اور آسائنگے سے زین پر بیل بوٹے بنانے لگا۔

اس روز علی احمد کے کمرے سے ٹین کے سپاہی کی ہی ہی سنائی دینے کی بجائے ربوڑ کی گڑیا کی چیزیں چیزیں سنائی دے رہی تھی۔ اور ایلی جیران تھا اور فرحت یوں خلا میں گھور رہی تھی جیسے کچھ بھی نہ ہو۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور نہستی ہوئی تکل۔ ”ماں۔ ماں آسافیل تو نہیں۔ آساتو پاس ہے۔ نہ جانے کس نے اس سے کہہ دیا ہے کہ تو فیل ہے خواہ گتو اہ تو پاس ہے۔ میں نے خود نتیجہ دیکھا ہے۔ تو نے کہا نہیں تھا۔“ اس نے آسا کو مخاطب کر کے کہا۔

”یو پاگل ہے۔“ آسا کی ماں بولی۔ آسا پاگلوں کی طرح پنسا اور پھر خاموش ہو گیا کورے دانت چمکے علی احمد سر کھجانے لگے۔ ”اوں کی ضرور آؤں گی۔ با بوجی۔“ وہ بولی ”چل ماں“ اور مرد مرد کر دانت چمکاتی ہوئی سیاہ گھنگھر پر کوناگلوں پر پیشی ہوئی چل پڑی۔ اب آسا سب سے آگے تھا یہیشے اس کی ماں اور سب سے پیچے کو رکھی۔

نہیں جاتے دیکھ کر ایلی بایپر کلا مختلط ربانے لکھر میں گھونٹنے لگا۔ باور پی خانے میں داخل ہوا تو دفعتاً سر گوشیوں کی آوازیں بند ہو گئیں۔ ہاجرہ چوہبہ کے پاس بیٹھی تھی۔ اس سے ذرا پر رفیقان گھنگھرے پر بوٹیاں بنارہی تھیں۔

ظاہر تھا کہ وہ دونوں کورے متعلق بائیں کر رہی تھیں۔ لیکن کیوں ایلی کے آنے پر وہ دفعتاً چپ کیوں ہو جایا کرتی تھیں۔ یوسرے سر جوڑ کر دلبی دلبی آواز میں پھروں باقیں کرتے رہنا اور رفیقان کے ہونٹوں پر وہ دلبی دلبی مسکرا قٹ جیسے وہ اپنے اپ کو ڈھوکا دے رہی ہو جیسے وہ ہاجرہ کو فریب دے رہی ہو۔ اماں اسے اس قدر اچھا کیوں سمجھتی تھیں اور وہ چلتے وقت جان بو جھو کر اس طرح قدم کیوں اٹھاتی تھی کہ اس کے گھنگھرے میں دائرے پڑیں اور علی احمد کے کمرے کے پاس سے گذرتے ہوئے اس کی گرد مورنی کی طرح تن کیوں جاتی تھی۔ ایلی کو ان سب باتوں کی وجہ سے رفیقان سے نفرت تھی۔

شدید نفرت ایسی نفرت جو اسے کورے بھی نہ تھی۔

نوکرانی کے ہاں بچے

چند ہی دنوں ان کے یہاں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک روز وہ گلی میں کھیلنے کے بعد

جب گھر میں داخل ہوا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو فرحت نے اسے روک دیا۔
”اونہوں اندر نہ جانا“

وہ اس بات پر حیران رہ گیا ”کیوں اندر کیا ہے“
”اماں بیمار ہیں۔“ فرحت نے کہا۔
”تو کیا ہوا؟“ ایلی نے کہا۔ وہ تو ان کا اپنا کمرہ تھا۔ علی احمد کا کمرہ تو نہ تھا جس میں
جانے سے نمیشہ ٹھبڑایا کرتا تھا اور داخل ہونے سے پہلے ان جانے میں کھانتا اور
پھر نگاہیں جھکا کر داخل ہوتا جیسے کوئی جرم یا گناہ ہو مگر یہ تو ان کا اپنا کمرہ تھا۔ پھر
فرحت کا اسے روکنے سے کیا مطلب تھا۔ اگر اماں بیمار تھیں تو کیا تھا۔ بیماری کی وجہ
سے کمرے میں جانے کی ممانعت نہیں ہو سکتی۔ اماں دنعتاً میم تو نہیں بن گئی تھیں
کہ بیماری میں لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا تھا یہ سب فرحت اپنی طرف سے کہہ رہی
تھی۔ ایلی نے سوچ کر سینہ تان لیا۔ ”نہیں نہیں میں جاؤں گا۔“ وہ بولا۔

عین اس وقت رویقاں دوڑتی ہوئی باہر نکلی ”تمہیں مبارک ہو۔ تمہارے ہاں ایک
نخا بھائی ہوا ہے۔“ بھائی ہوا ہے۔ اس کی سمجھی میں نہہ آیا۔ بھائی کیسے ہو سکتا تھا۔
رویقاں کا مطلب کیا تھا۔ اماں کے ہیباں بیٹا لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ اماں تو اس گھر کی
نوکرانی تھی۔ نوکرانی کے گھر بیٹا۔ اماں تو علی احمد کے کمرے میں کبھی نہ گئی تھی۔ اماں کو
تو کبھی آواز پڑتی تھی۔ ہاجرہ سو گئی کیا۔ اماں تو ایسی نہ تھی۔ پھر اماں کے ہاں بیٹا نہیں
نہیں یہیں ہو سکتا۔ یہ گناہ تھا بے عزتی تھی۔ نوکرانی کے بے عزتی۔ اماں نے تو کسی
کلرک کو بھرتی نہ کرنا تھا۔ پھر یقیناً رویقاں بکتی تھی۔ وہ دوڑ کر اندر گیا اور ناخنے منے
بچے کو دیکھ کر شرم سے زمین میں گڑ کے رہ گیا۔ پھر وہ باہر آبیٹھا اور محسوس کرنے لگا۔
جیسے وہ آسا ہو۔ جیسے علی احمد نے اس کی ماں کو بھی کھلونا بنایا ہواں خیال پر اس کے
دل کو ایک دھپکا سالاگا۔

وہ صحن میں خاردار درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ چاروں طرف فور اپنی چھائی ہوئی تھی۔

دور تک کچی اینٹوں کی منڈیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور اس سے پرے ریت کے ٹیلے اداں کھڑے تھے۔ آسا۔ آسادرخت پر بیٹھا ہوا کو اچلایا۔ اس نے غصہ میں ایک پتھراٹھا کر اس کی طرف پھینک دیا۔

ہاجردہ کے کمرے میں شور مچا ہوا تھا۔ محلہ والیاں اور پنچی آواز میں چلا رہی تھیں۔
”بہن تمہیں مبارک ہو۔“

وہ ہاجردہ کو مبارک باد کیوں دے رہی تھیں۔ لوگ کیوں ہاجردہ کے کمرے میں جمع ہوتے جا رہے تھے۔ کیوں لوگوں کو تو چاہئے تھا کہ اس سے نفرت کریں جو نوکرانی ہونے کے باوجود گود میں بچھ لئے پڑی تھی۔ لیکن اماں کو بھی احساس نہ تھا۔ کس بے شرمی سے مسکرا رہی تھیں جس سے شرم نہ آتی تھی۔ میرا ماں تو ایسی نہ تھی۔

ایلی شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ اب وہ لوگوں کو کیسے مند کھائے گا اب وہ اپنی ماں کے سامنے کیسے جائے گا اور فرحت

فرحت کو اس بات پر کتنا دکھ ہو گا۔ مگر فرحت تو خوشی سے پھولے نہ سارہی تھی۔ کیا فرحت کو یہ بات گوارا تھی۔ کیا اس حادثہ پر اسے دکھ نہ ہوا تھا۔ ادھر ابا اپنے کمرے میں آتاوں کی طرح اطمیناً سے بیٹھ لکھ رہے تھے۔ جیسے انہیں نوکرانی اور اس کے نواز نیدہ بچے کی خبر ہی نہ ہو۔

بچے کی مبارکباد دینے کیلئے مختلف قسم کے لوگ آتے تھے۔ کچھ تو ہاجردہ کی کوٹھڑی میں جا کر گھس جاتے اور کچھ علی احمد کے کمرے سے آگے نہ جاسکتے۔ کوران لوگوں میں پیش پیش تھی۔ ”بابو مبارخ ہو۔“ وہ دوسرے چلاتی ہوئی آئی پھر علی احمد کے کمرے میں داخل ہو کر یوں مطمئن ہو گئی۔ جیسے علی احمد ہی زچہ اور بچہ ہوں۔

علی احمد کا کمرہ کور کے لئے مخصوص ہوا جا رہا تھا۔ ہر دوسرے تیسرا دن وہ دانت چمکائی گھکھرا جھلاتی آموجو ہوتی۔ ”کہو بابو جی کیا حال چال ہے نھا کیما ہے۔ اس کے سفید دانت سیاہ رنگ میں چمکتے۔“ آگئی تو ”علی احمد اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے۔

”اچھا تو ابھی یقین نہیں آیا۔“ وہ غصے کی رہی ہاتھ میں پکڑ کر چاہک کی طرح جھلاتے ہوئے چلتی۔

یہ دیکھ کر ٹین کا سپاہی جوش میں آ جاتا ”اچھا یہ جرأت۔“

پھر کمرے میں اور ہم بھی جاتا اور ایلی غصے میں مٹھیاں بھیختا ہے ”لتنی مکروہ آواز ہے کور کی، اندرا کس قدر ننگا ہے۔ ننگا اور غایظ“ اسے کور سے فرت تھی اور وہ آسا کو دیکھ کر غصے میں ہونے لگتا تھا۔ کیونکہ وہ محسوس کرتا جیسے خود آسا ہوا وہ کفر کی کامتحان پاس کرنے کے لئے با جرہ کوئی کہ لیا ہو۔

ایلی بڑی محنت سے اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنے کی کوشش کرتا مگر ان آوازیں اس کے کانوں پر ہتھوڑوں کی طرح پر ٹکیں۔ پھر وفتحا علی احمد کے کمرے کا دروازہ کھلتا اور علی احمد کی آواز سنائی دیتی ایلی، ایلی۔

دھرم بھرست

اس وقت ایلی کا علی احمد کے کمرے میں جانا کس قدر شوار اور پر افیمت ہوا کرتا اور وہ دروازے پر جا کر رک جاتا۔ اندر جانے کی ہمت نہ پڑتی۔ پھر وہ انتظار کرتا کہ ایک بار پھر آواز پڑے تو اندر جائے۔ باہر چل چلا تی دھوپ میں اسے کافی دری تک کھڑا رہتا پڑتا۔ اندر رہنکی گڑیاں جانے کیا کیا تماشے کرتی۔ ان تماشوں میں وہ دونوں بھول جاتے کہ انہوں نے ایلی کو آواز دی تھی۔

”اے ایلی،“ دوسری مرتبہ آواز پڑنیست پر وہ ڈرتا ڈرتا اندر داخل ہوتا اکثر دونوں ایک دوسرے سے یوں باتوں میں مشغول ہوتے ایک دوسرے میں اس حد تک کھوئے ہوتے کہ دری تک قریب کھڑے ایلی کی طرف ان کی توجہ مبذول نہ ہوتی۔ پھر علی احمد چونک کر کہتے ”اوہ تو آگیا ایلی۔“ وہ میز پر یوں پڑی ہے۔ اس میں پانی لے آ کور کو پیاس لگی ہے۔ ایلی غصے سے تنگ منہ والی یوں کو دیکھتا گردن مروڑ کر اسے اٹھایتا۔

”اے میلی۔“ کو رچلاتی ”کنوئیں سے لانا۔“

ایلی کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ کنوئیں سے لانا۔ بڑی آئی دھرم والی چاہے خود روز بھر شست ہوتی رہے۔ پر دھرم بھر شست نہ ہو۔ اس گھر کا پانی نہ پئے گی۔ ملکے کا پانی نہ پئے گی۔ دھرم بھر شست ہوتا ہے۔ لیکن بند کمرے میں خون چونے سے دھرم بر شست نہیں ہوتا۔ مسلمان سے کشتنی کرنے سے دھرم بھر شست نہیں ہوتا۔ ہتھیار پر دو روپے رکھوانے سے دھرم بھر شست نہیں ہوتا۔ بڑی دھرم والی بندی پھرتی ہے۔ کنوئیں سے لانا غصے میں وہ بل کھاتا۔ لیکن بل کھانے کے علاوہ وہ کبھی کیا سکتا تھا۔ چلچلاتی دھوپ میں چلتا ہوا غصے کی آگ میں کھولتا ہوا وہ کنوئیں پر پہنچتا راستے میں وہ بار بار دانت پیس پیس کر بوقت کی گرد مردہ رہتا۔ جیسے وہ کوئہ بوقت کی گردان مر وڑنے سے اس کی ایک گونہ تسلی ہو جاتی تھی۔

بام آباد میں کنوئیں نہیں تھے۔ جن میں ڈول ڈال کر پانی نکالا جاسکتا۔ وہاں سب کنوئیں راہٹ والے تھے۔ چلچلاتی دھوپ میں ایلی کو تین تھارہ بھٹ کو بیل کی طرح کھینچاڑتا اور تو اس کے چلانے سے رہٹ کا چکر ہتا بھی نہ تھا۔ دم لینے کے بعد ہو پھر سے رہٹ کو دھکلیتا اور پھر تھک کر رک جاتا تاکہ تازہ دم ہو کر اسے چلا سکے اور جب چلتا ہانی کا اتنا بڑا دھارا بوقت پر گرتا تو بوقت گر کر اونڈھی ہو جاتی اونڈھی نہ بھی ہوتی تو بھی پانی اور دھرہ بھر جاتا اور بوقت خالی رہ جاتی۔ اس نے کئی بار علی احمد کے گھر میں کوئے کے نزدیک اور کوئی برتن نہ تھا، جس میں دھرم بھر شست کے بغیر پانی پیا جاسکتا ہو۔ علی احمد بیچارے کر بھی کیا سکتے تھے وہ کوئی بات سن کر نہیں دیتے اور کوئا نہیں ہستتا دیکھ کر کمرے میں لگئے ہوئے پنگے کی رسی معنی خیز انداز سے گھماتی جس پر علی احمد اور بھی ہٹنے لگتے اور بات شروع ہوئے بغیر ہی ختم ہو جاتی۔

علی احمد رسی کا سنگل دیکھتے ہی ٹین کے سپاہی میں تبدیل کر رہا کی گڑیا پر وار کرنا شروع کر دیتے۔ جیسے کہ ایک سپاہی کا فرض ہوتا ہے اور ایلی بوقت ہاتھ میں اٹھائے

کھڑے کا کھڑا رہ جاتا اور اس کی رہٹ اور بوتل کی داستان علی احمد اور کورکے
قہقہوں میں دب کر رہ جاتی۔

ایک روز کنوئیں سے پانی لاتے ہوئے اسے ایک خوفناک خیال آیا۔ اس کا دل
دھک سے رہ گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ وہ پہر کی کڑتی دھوپ میں بام آباد
کاؤہ ریتل میدان ویران پڑا تھا۔ دور تک گلیوں میں کوئی نہ تھا۔ اس نے بوتل کی
طرف دیکھا ایک بارہ پھر چاروں طرف نکلا دوڑا۔ مضمون ہونے کے بعد ایسا
نے منہ میں ٹھوک بھرا اور پھر دھڑکتے ہوئے بوتل میں ٹھوک دیا۔

اس روز پانی لاتے ہوئے وہ بے حد سرو رکھا جیسے اس نے اپنے شمن کو ہمیشہ
کے لئے زیر کر لیا ہو۔ جیسے اس کا انتقام پایا۔ بھیل تک پہنچ چکا ہوا۔ پھر دفعاً اسے ایک
اور خیال آیا وہ رک گیا اور بوتل زمین پر ٹکر سوچنے لگا۔ اس کا دل دھک دھک نج
رہا تھا۔ منہ سرخ ہو رہا تھا۔ اور بدن پر چیزوں نیاں رینگ رہی تھیں۔ لیکن وہ ڈر گیا اس
میں اس قدر جرأت نہ تھی اس کے علاوہ اس کھلے میدا میں کوئی جگہ نہ تھی۔ جہاں وہ
اپنے خیال کو عملی جامہ پہنا سکتا۔ لیکن ڈیورڈی میں پہنچ کر دفعاً اس نے محسوس کیا کہ
وہاں اسے کوئی بھی نہ دیکھ سکتا تھا۔ کوئی نہیں۔ خوشیے اس کا چہرہ تتما اٹھا وہ خوش
تھا۔ اس کا انتقام ادھورانہ رہے گا۔ اس نے بوتل ایک کونے میں رکھ دی۔ دروازے
کی کنڈی چڑھاوی اور پھر بوتل میں پانی کی سطح اباہر رہی تھی۔

اس روز کورکو بوتل سے پانی پیتا دیکھ کر اس کی خوشی کی کوئی انہمانہ رہی۔ خوشی اس
کے دل میں یوں چھلک رہی تھی، جیسے سوڑے کی بوتل میں جھاگ اچھلتے ہے۔ اس کا
جی چاہتا تھا کہ فرحت اور ہاجرہ دونوں کو اپنی مسرت میں شریک کر لے۔ محلے کے ہر
دروازے کو جا کر کھلکھلانے اور انہیں اپنارات بتائے اور ۳۲ رپھران کو اپنے ساتھ علی
احمد کے کمرے میں لے آئے تاکہ وہاں وہ سب کورکو بوتل سے پانی پیتے دیکھیں۔
اماں کو بتانا بے کار تھا۔ اماں تو نصیحتیں کرنے کے سوا کچھ جانتی ہی نہ تھی ایسا کوئی

بات بھی وہ جواب میں فصیحت فرمادیتی کہا کرتی تھی کوئی برداشتا ہے تو کرنے والیں تم اس کے ساتھ رہائی نہ کرو۔ اس پر ایسا محسوس کرتا۔ جیسے اماں عیسائی ہو جواہیک گال پر تھپٹر کھا کر دوسرا پیش کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ہونے اماں تو خواہ مخواہ بنتی تھیں۔ اس کے علاوہ جب سے اس کے یہاں بچھہ ہوا تھا۔ ایسا کی اس کے متعلق رائے بدلتی تھی۔ اس لئے وہ خاموش رہا۔ اس نے بوتل کے پانی کا راز کسی کو نہ بتایا بلکہ اس روز کے بعد اسے بوتل بھرنے کی کوفت سے نجات مل گئی۔

اس سے پہلے وہ کورنی ہمڈ کی خبر سن کر بھرا جایا کرتا تھا۔ اب اسے بوتل بھرنے کے لئے جانا پڑے گا۔ چل جاتی رہوپ میں کنوں میں کا بھاری چکرو ٹھکلنا پڑے گا لیکن اب جو نہیں وہ گھر میں داشت ہوتی ایسا کا جن چاہتا کہ وہ جلدی پانی مانگے اور ایسا بوتل میں نفرت کا زہر بھر کر لادے۔ اب اسے کنوں میں چکر چلانے اور بوتل بھرنے میں کوفت کی بجائے سرست ہوتی اور پھر جب چوگان میں بیٹھ کر وہ منہ میں تھوک اکٹھا کرتا تو اس کا چہرہ خوشی سے لال ہو جاتا پھر ڈیوڑھی کی طرف بھاگتا اور بالآخر بوتل اٹھا خوشی خوشی علی احمد کے کمرے کی طرف چل پڑتا۔ اس خوشی میں یہ قطعی طور پر بھول جاتا کہ علی احمد کے کمرے میں کھانس کر داخل ہونا چاہئے اور وہاں جانے سے پہلے سرجھا لیا چاہئے۔

انوکھے جذبات

اس زمانے میں وہ محبت کے اویں جذبات سے واقف ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں نئے انوکھے جذبات ابھر رہے تھے۔ بلا وجہ سکول کے دو ایک لڑکے اچھے لگنے لگے تھے۔ حالانکہ اچھا لگنے کی کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی۔ پھر بھی وہ اسے اچھے لگتے تھے۔ مثلاً اس کے ہم جماعتوں میں ایشور لال، پکاش اور گھنٹاشام تھے۔ مثلاً اسے گھنٹاشام کا چپ چاپ کھڑا ہونا۔ وہ ایک عجیب انداز سے کھڑا ہوتا تھا۔ اس کی ایک نانگ سیدھی ہوتی۔ دوسری یوں خمیدہ رہتی جیسے ازلی طور پر اس میں سیدھا ہونے کی

صلاحیت ہی نہ ہو۔ ہونٹ یوں آپس میں چکلی سی بنائے رہتے جیسے ابھی کوئی بات کرنے والے ہوں، مگر ہونٹوں پر آئی ہوئی وہ بات ہونٹوں میں دلبی رہتی۔

پھر وہ پر کاش تھا۔ پر کاش کا پھولا پھولا چہرہ اور اس کے رخسار پر وہ سیاہ ٹل اسے بڑا چھا معلوم ہوتا تھا اور ایشور لال کا وہ قہقہہ۔ اس کا بے تکلف انداز۔ اس کا المبا سا منہ اور میلے دانت ابھی بڑے اچھے لگتے تھے۔ ایسی نصیح شام ایشور لال کے ساہت رہتا تھا اور شوق نے اس کی باتیں سنتا رہتا۔ حالانکہ ایشور لال کے دانت بڑے بحدے اور زرد تھے اور اس کے منہ سے بوائی تھی پھر وہ بوکتی اپنی لکتی تھی اسے ایشور لال کا بو لے جانا بولے جانا۔ اونچی آواز میں شوال مچانا۔ اس کی پچھی پیشی آوازن کر ایلی محسوس کرتا۔ جیسے اس پر پیدا نہ کر دیا گیا ہو۔ وہ یقینیت اس قدر پر لذ رمح سوں ہوتی تھی۔

روز شام کے وقت ایلی اس طرف نکل جاتا۔ جس طرف گھنٹام کا گھر تھا اور گھنٹوں گلیوں اور بازاروں میں اس امید پر آوارہ پھرتا کہ شاید گھنٹام کسی کام کے لئے باہر نکلے اور پھر۔ پھر اسے دیکھ کر رک جائے۔ کھڑا ہو جائے اسی طرح جس طرح سکول کے برآمدے میں کھڑا رہتا تھا۔ ایک ناگ سیدھی اور دوسری میں خم پھر وہ دونوں پاؤں ملا لیتا اور پنجوں کے بل کھڑا ہو کر ایڑیاں اٹھالیتا اور پھر پنجوں پر جھولنے لگتا۔ ایلی کو یوں لگتا جیسے کوئی نخا سافر شستہ فضا میں تیر رہا ہو۔ اس کے ہونٹ کلی سے بنے رہتے تھے۔ نہ جانے ہونٹ کیوں کلی سے بن جاتے تھے۔ جیسے اس نے کوئی بڑی شفاقتہ بات سنی ہو یا کہنے والا ہو۔

بیٹھے بٹھائے ایلی کے دل میں افطراب سا پیدا ہو جاتا اس کا جی چاہتا کہ وہ ایشور لال کی باتیں سننے یا گھنٹام کے سامنے کھڑا ہوا اور فضا میں کوئی پیار افسر شستہ جھوول رہا ہو یا پر کاش کا گول چہرہ اس کی نگاہوں میں سما جاتا اور وہ بتا ب ہو کر اٹھ بیٹھتا

اور باہر گلی میں جا کر ٹھلتا تو پڑوں والے گھر سے زاہدہ عابدہ کی آوازیں کان میں پڑتیں کس قدر سریلی آوازیں تھیں۔ دل میں تیر کی طرح چھپ جاتی تھیں اور پھر اندر رجا کر ڈو لئے لگتیں جیسے دل میں کوئی فرشتہ پنچوں کے بل کھڑا جھول رہا ہو۔ آوازوں میں کیسا جادو تھا۔ کیوں۔ شکل میں تو بالکل سیدھی سا وہی تھیں۔ رنگ بھی کالا اور ان میں کچھ بھی تو جاؤ بُ نظر نہ تھا۔ لیکن آوازیں ایلی کو بیتا ب کر دیتی تھیں۔ تیکھی سریلی اور ولچد ار آوازیں۔

پھر دفلتا اسے خیال آتا کہ قریب ہی وہ چنی سفید نر نیز کے مقابل کھڑی آپ ہی آپ شرما رہی ہو گی۔ جیسے اس کی عادت تھی مسکراتے ہوئے اس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے تھے لیکن وہ مسکراتی کیوں تھی۔ مسکراتنے کی کوئی وجہ بھی تو معلوم نہ ہوتی تھی۔ زرد رنگ کے مرہموں سے مرتبا نوں اور کڑوی دوائیوں کی بوتلوں کے درمیان کھڑے ہو کر مسکراتا۔ ایلی کے لئے یہ عقدہ ناقابل حل تھا۔ پھر اس کی چال۔ کس پھبن سے چلتی تھی۔ مسکراتی تو جیسے چرا غروشن ہو جایا کرتے۔ مگر وہ ایلی کو دیکھ کر قطعانہ مسکراتی تھی۔

ہاں اس روز جس روز اماں نے اسے بلا یا تھا۔ جب ان کے گھر نکلا ہوا تھا اس روز علی احمد بازار نر سے با تین کرتے رہے تھے۔ نر مسکراتی تھی اور منہ موڑ لیتی تھی پھر منہ موڑ کر مسکراتی تھی اور علی احمد گھوم کر پھر اس کے سامنے آ کھڑے ہوتے تھے۔

زاہدہ اور عابدہ کے خیال سے بچنے کی کوشش میں ایلی نر کے خیال میں کھو جاتا مگر دپنسری کی کھڑکی تک جانے کی اس میں ہمت نہ پڑتی۔ پھر اس کے خیال کا رخ زاہدہ کے بھائی فرید کی طرف منعطف ہو جاتا کتنا شوق تھا اسے نر کو دیکھنے کا۔ فرید پھر پور جوان تھا۔ اس کا جسم کتنا بڑا تھا۔ موٹے موٹے ہاتھ۔ پھولی پھولی پنڈلیاں اور بھرے بھرے بازو۔ وہ نر کے لئے ہر وقت مضطرب رہتا تھا۔

”ایلی، وہ اسے گلی میں دیکھ کر رک جاتا۔“ ایلی ذرا جانا تو ہسپتال کی کھڑکی سے جھانکنا ہے یا چلی گئی۔ خدا کے لئے ابھی جاؤ۔ یار ہم تو مر گئے۔ تباہ ہو گئے۔ اس کے لئے اور پھر وہ مضطربانہ گلی میں گھومنے لگتا۔ بار بار جسم کھجاتا اور دپنسری کی کھڑکی سے نہ اس کی طرف دیکھ کر مکررا کر منہ موز لیتی اور اپنے کام میں لگ جاتی جیسے کچھ خبر یہ نہ ہو کہ باہر کون کھڑا ہے۔

نہ مسکراتی کیوں تھی۔ مسکرانے کے بعد منہ کیوں موز لیتی تھی۔ ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ پھر وہ ہسپتال کی طرف جاتا کھڑکی میں سے دھڑکتے دل سے جھانکتا۔ کتنی سفید تھی وہ چٹی سفید ایلی کو گوارنگ بے حد پسند تھا۔ لیکن نہ اس کی طرف دیکھتی بھی نہ تھی۔ مسکراتی بھی تو اسے محسوس ہوتا۔ جیسے وہ مسکراہٹ بالکل روکھی پھیکی ہو۔ نہ جانے ایلی کے روپ و نہ ایلی کیوں نہ مسکراتی تھی جو وہ فرید کے سامنے مسکرا یا کرتی تھی اور ایلی کو دیکھ کر وہ منہ بھی تو نہ موز لیتی تھی۔ اس پر ایلی کو بے حد دکھ ہوتا اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی کو نہ میں جا کر رو دے چینیں مamar کروئے۔ مگر وہ بھی تو نہ آتا تھا اسے۔

اس روکھی مسکراہٹ والی نہ سے مالیوں ہو کروہ از سر لوگھنثام کے خیال کی طرف متوجہ ہو جاتا اور ہسپتال کی کھڑکی کو چھوڑ کر بازار کی برف چل پڑتا۔ شاید گھنثام کہیں بازار میں کھڑا ہو۔ شاید ایشورگلی میں کھیل رہا ہو۔ یا شاید پرکاشت۔

ایلی کے دل میں انوکھی بیداریاں پیدا ہو رہی تھیں۔ جوں جوں اس کے دل میں نئی آرزوں میں تشكیل پائے جاتیں توں توں اس کے دل میں علی احمد کے کمرے سے نفرت بڑھتی جاتی اور اس کرے میں جانے والیوں کے خلاف بعض شدید تر ہوتا جاتا اور اماں اور فیقاں کے متعلق شبہات تقویت پکڑتے جاتے۔

اماں تو اب نخنے میں کھوچکی تھیں۔ صبح و شام دون رات وہ نخنے کی دیکھ بھال میں وقت بس رکتی اور با قیماندہ وقت باورچی خانے میں گزارتی۔ فرحت بھی ہر وقت

نخے کو کھلانے میں لگی رہتی تھی۔ رفیق اسے کھلاتی تو نہ تھی۔ مگر بڑے شوق سے دیکھتی۔ اتنے ہی سیدھی نخے کی طرف جا کر اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہتی ”یہ نخا بال ہے۔ یہ مینڈ حاس میں ہے۔“ اور پھر باور بھی خانے میں بیٹھ کر گھرے پر

Jawab

علیٰ احمد اب بھی صاریح حساب کتاب لکھنے میں وقت صرف کرنے تھے اور کوئی بھی مہینے میں صرف شاہراہیک مرتبہ آتی تھی۔ اب تو ایسا کوئی میں چند رات وچھپی نہیں رہی تھی وہ اس کی بولی میں تھوکنے سے بھی کتا چکا تھا۔ جب بھی علیٰ احمد اس سے پانی لانے کو کہتے تو وہ چیپے سے بولیں اٹھا کر باہر گھلٹ آتا اور پھر گھرے سے پانی بھر لیتا پھر کچھ دریہ گلی میں کھلنے کے بعد بولیں اٹھا لرایا کے کمرے کی طرف چل پڑتا اور کوئی سمجھتی کہ وہ پانی کنوں میں کا ہے۔ کوئی پانی کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی وہ تو بند کمرے میں رہنے کی گڑیا کی طرح چیں چیں کرتی اور جاتے وقت دور و پوپ کیلئے علیٰ احمد سے جھگڑا کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ علیٰ احمد کا بھی کوئے دل بھر چکا تھا کیونکہ اب وہ اس کے آنے پر بھی کام میں لگے رہے تھے اور اس کے جانے سے پہلے ہی پھر سے لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ نہ جانے ان دنوں وہ کے چھٹیاں لکھ رہے تھے۔ ہر دوسرے تیسرا دن وہ ایک چھٹی لکھ کر ایسا کو دیتے ”لو بھی اسے لیٹر بکس میں ڈال آؤ۔“

پہلی مرتبہ جب ایسا نے لفافے کا پتہ پڑھا تو وہ حیران رہ گیا۔ استانی کے نام چھٹی اور وہ بھی شامکوٹ والیں کیا وہی جس نے شلوار کی جگہ چادر پیٹ رکھی تھی؟ وہ تو شاید اس بات کو اہمیت نہ دیتا لیکن گلی میں فرید نے اسے پکڑ لیا ”ہوں استانی کو خط جارہا ہے۔ کون ہے یہ استانی۔ وال میں کچھ کالا ہے دوست!“ اس وقت ایسا نے بھی محسوس کیا کہ وال میں کچھ کالا ہے۔ لیکن اس کی تجھمیں نہ آیا کہ وال کون تھی اور کالا کون تھا۔ استانی تو وال نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر فرید نے اس کا ہاتھ قائم لیا اور عجیب سی

نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ ”ایلی“، اس نے معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھا ایلی کے جسم میں تھجھنا ہٹ سی دوڑ گئی۔ ”ایلی“ فرید نے اس پر بھر پور نگاہ ڈالی۔ ایلی کی ایڑیاں ہوا میں معلق ہو گئیں اور وہ فضا میں جلو لئے لگا جیسے وہ کوئی نسخافرشتہ ہو۔ وہ محسوس کرنے لگا جیسے وہ خود گھنٹام ہوا اور کوئی ایلی اس کی طرف دیکھ رہا ہو۔ اس کے جسم میں چیوٹیاں ہی روڑنے لگیں۔

اس روز ایلی دریتک آئینے کے سامنے ہٹا رہا۔ لیکن وہاں تک بھدے کالے اور بھونڈے لڑکے کے سوا پچھانے تھا پھر اس نے باہر جا کر صابن سے منہ ڈھویا شاید وہ پہلا دن تھا۔ جب اس نے اس شدت سے محسوس کیا تھا کہ وہ بد صورت ہے۔ اس کی سمجھ میں پچھان آتا تھا کہ فرید اسے ایسی نگاہوں سے کیوں دیکھتا تھا۔ نہ جانے وہ ایسی آنکھیں کیونکر بنا لیا کرتا تھا اور پھر اس کا ”ایلی“ کہہ کر خاموش ہو جانا۔ جیسے اس کی آواز حلق میں خشک ہو گئی ہو۔ لیکن اس کے اپنے جسم پر چیوٹیاں ہی کیوں رینگنے لگتی تھیں۔ وہ چیوٹیاں گدگدی کیوں کرتی تھیں۔ جس سے دل میں کچھ کچھ ہوتا تھا۔ عجیب سا احساس تھا وہ۔

ان جانے میں ایلی کو فرید سے ڈر لگنا شروع ہو گیا اور اس نے فرید کے گھر کی طرف جانا چھوڑ دیا۔ لیکن کیوں۔ وہ یہ نہ جان سکا۔ اس کے باوجود جب کبھی وہ کپڑے بدلتا یا جوڑا پہنتا۔ تو اسے کوئی نہ کوئی ضروری کام پڑ جاتا اور مجبوراً اسے گلی میں اس سمت کو جانا پڑتا۔ جہاں فرید کا گھر تھا۔ جاتے ہوئے اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ہر آہٹ پر اس کے دل پر عجیب سادباً محسوس ہوتا۔ جیسے کسی نے اسے پکڑ لیا ہو۔ ”ایلی“ اسے خواہ نتوہ آوازیں سنائی دیتیں اور پھر جسم پر چیوٹیاں رینگنے لگتیں۔ گلی میں فرید نہ ملتا تو وہ اطمینان کا سنس لیتا لیکن دل میں دبی دبی سی خلش کانٹے کی طرح لگی رہتی اور بالآخر ما یوس ہو کر گھنٹام کے گھر کی طرف چل پڑتا۔ شاید گھنٹام بازار میں کھڑا ہو۔ اس کی نگاہ تلے گھنٹام آ کھڑا ہوتا۔ جس کے پاس

ہی فرید کھڑا نہس رہا ہوتا فرید اور گھنٹام۔ اب اس کے ذہن میں لازم و ملزم ہوئے جا رہے تھے۔ روز بروز بے تاب ہوا جا رہا تھا۔ بات بات پر اس کا دل دھڑکتا ایک ضطراب چاروں طرف سے اس پر یورش کر دیتا اور اس ضطراب کے تعاقب میں وہ آوارہ پھرتا۔ گلی میں میدان میں بازاروں میں اور کھر میں بھی وہ منظر سا گھر دھنٹا اس قدر رو سمع کیوں ہو گیا تھا اور علی احمد کا کمرہ روز بروز مسکرا کر چھوٹا کیوں کیوں انہیں اور ان کے کمرے کو آسمانی سے نظر انداز کر سکتا تھا۔

کشمیر کا سبب

ان دونوں علی احمد ضطراب رہنے لگے تھے۔ لکھتے لکھتے وہ قلم رکھ کر باہر آ جاتے اور کسی لوٹی ہوئی چار پائی پہاڑوں میں سر تھام کر لیت جاتے۔ دری تک چپ چاپ لیٹے حقہ پیتے رہتے پھر دھنٹا جوش میں اٹھ بیٹھے اور کسی نہ کسی بہانے کشمیر کی بات شروع کر دیتے۔ ”ایجی کیا بات ہے کشمیر کی۔ اللہ تعالیٰ نے زمین پر جنت کا نمونہ اتار رکھا ہے۔ رہنے کا مزہ ہے تو کشمیر میں۔“ وہ کسی کو مخاطب کئے بغیر کہتے ”مرد قد درخت لختہ نہیں [صل] بے اندازہ۔ پھل کھاؤ، چشموں کا لختہ اپانی پیو۔ اجی وہاں کے رہنے والے حسین نہیں ہوں گے تو کون ہو گا۔“ یہ محسوس کر کے کہ ان کی بات کوئی نہیں سن رہا علی احمد بھی نہ گھبرا تے تھے۔ ”جنہوں نے صبح شام سب کھائے ہوں ان کی شکل سب سی نہ ہو گی تو پھر کیسی ہو گی۔ سیدھی بات ہے کیوں رفیقان جو سب کھا کر پلے گا وہ برآ ہو کر سب بن جائے گا۔ ہی ہی ہی۔ کیا کہتی ہے۔“ اندر باور پھی خانے میں رفیقان چپ چاپ بیٹھی مسکراتی رہتی۔ ”کیا بات ہے کشمیر کی۔ واہ وا کسی شاعر نے کہا ہے۔

اگر فردوس بے روئے زمین است
ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است
ایلی یہاں آؤ۔ اہر تمہیں اس شعر کا مطلب آتا ہے کیا؟“ وہ شعر پھر سے دہراتے

اور ایلی کی خاموشی پر کہتے ”او تمہیں اس کا مطلب سمجھائیں لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ کشمیر ہے کہاں _____ وہ تو ٹھیک ہے یہ بتاؤ کہ وہاں گرمی کیوں نہیں پڑتی اور وہاں چشمے کیوں پھوٹتے ہیں۔ شباباش ٹھیک پہاڑ تو ہے لیکن پہاڑ پر رہنے والے۔ رفیقان تم جانتی ہو پہاڑ پر رہنے والوں کے چہرے عجیب کی طرح کیوں ہوتے ہیں۔ ایلی کی ماں تم نے دیکھا ہے کسی جو برسوں کشمیر میں رہا ہوں۔ سبحان اللہ کیارنگ روپ ہوتا ہے۔ میمیں بیچاری کیا مقابلہ کریں گی۔ انگریز توبید صورت ہوتے ہیں۔ ان کے منہ پر تو نحوس تبرقی ہے۔ لیکن کشمیر والے۔ واه و سبحان اللہ۔“

گھر میں کسی کو سمجھنیں نہ آتا تھا کہ علی احمد بام آباد کے ویرانے میں بیٹھے بیٹھے دفعنا کشمیر کیسے جا پہنچے۔ باجرہ نے یہ عالم دیکھا تو ایک دن پچھے سے رفیقان کے کان میں بولی ”کوئی بات ہے ضرور کوئی بات ہے میں جھوٹ نہیں کہتی۔ میری بات یاد رکھو۔ اگر بات نہ نکلی تو میرا ذمہ اور بات نکلنے میں دیر بھی نہیں لگے گی ہاں۔ میں تو تپور پچھاٹتی ہوں ان کے۔“

رفیقان ہونٹ پر انگلی رکھ کر حیرانی سے باجرہ کی طرف دیکھتی ”اچھا۔ لو میں بیچاری کیا جاؤں۔“

بڑی بیچاری تو دیکھو۔ ایلی گھورتا۔

پھر دفعنا نھا بیکار پڑ گیا اور سب کی توجہ نہیں کی طرف مبذول ہو گئی۔ باجرہ رفیقان اور فرحت باجرہ کے پاس بیٹھی رہتیں۔ ایلی کو دن میں دو تین بار ڈپنسری جانا پڑتا۔ وہ نر س تک پہنچ تو جاتا لیکن اس سے برآ راست بات کرنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا۔ کئی باروہ بات کرنے کے لئے فرید کو ساتھ لے جاتا اور نر فرید کی طرف دیکھے بغیر جھینپختی۔

نر کی آمد پر علی احمد قمیص پہن لیتے اور نہیں کی چارپائی کے قریب آ کھڑے ہوتے۔ ”ہی ہی ہی ہی۔“ وہ نر سے اپنی بات شروع کر دیتے۔